پسِ منظر

(رامپور ۱۹۳۲ء سے لے کر ۲۰۰۲ء تک کا سلسلہ)

بچپن کا زمانہ بھی کیا اچھا زمانہ ہوتا ہے۔ کوئی فکر نہ کوئی غم، نہ اظہار پر کوئی پابندی۔ جو بات ذہن میں آئی، فوراً والدین سے سوال کرلیا کہ یہ کیوں اور کیا ہے۔ یہ احساس نہیں تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے، اور اگلے سال کی کیا بات، اگلے ہفتے ہی کی سوچ بچار بہت زیادہ تھی۔ اب ہم اس ستر سال کے رفت کو دیکھتے ہیں تو لگتا نہیں کہ سب کچھ بیان کر سکیں گے۔ کتنی زندگی سوچِ اوّل کے بغیر گزری اور کتنی زندگی میں ہم نے چُن چُن کے قدم اٹھائے۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ کہاں زیادہ فائدہ ہوا، پھونک پھونک کے قدم رکھنے میں یا خطرات مول لینے میں۔

ہماری وراثت

ہماری پیدائش یکم ستمبر ۱۹۲۹ء کو رامپور میں ہوئی۔ ہجرتیں اور سفر تو شاید ہمیں وراثت میں ملے۔ ہمارے بزرگ تو کچھ پشتوں سے رامپور ہی میں تھے، لیکن ہمارے اجداد ایران کے شہرِ قُم سے رامپور آئے تھے۔ بیسویں صدی میں شہرِ قُم آقائے خمینی کی وجہ سے شہرت میں رہا، لیکن اس سے پہلے بھی اس شہر کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ مستحکم رہی تھی۔ امام رضاؑ کی ہمشیرہ شہزادی فاطمہ بنتِ امام موسیٰ کاظمؑ ۲۰۰ھ میں جب مدینہ منورہ سے اپنے بھائی سے ملنے قم تشریف لائیں تو ان کے ساتھ ہمارے بزرگ اور دوسرے علماء قُم آئے۔ اس

زمانے کے سفر سخت تھے، اور سفر کی قیمت کا سب سے بڑا حصّہ تھا وقت۔شہزادی کے قم پہنچنے سے پہلے ہی امام رضاؑ انتقال فرما چکے تھے۔شہزادی نے اپنی بقیہ زندگی وہیں بسر کی اور وہیں مدفون ہوئیں۔ بعد میں حالات کی خرابی اور کچھ مذہبی تعصّب کی وجہ سے پورے عرب اور ایران سے نہ صرف علماء، بلکہ تاجر اور سرمایہ کار بھی ہندوستان تشریف لے آئے۔ہمیں اس بات کا اندازہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نئی نئی حکومت نے مسلمانوں کے لئے نئے راستے بھی کھولے تھے۔ یہ نو وارد حضرات زیادہ تر اتُر پردیش میں آباد ہوئے، جن میں رامپور اور لکھنؤ بھی شامل ہیں۔ ہمارے اجداد پہلے لکھنؤ آئے اور مختلف سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ کچھ زمینداری میں آئے۔ ماضی اور حال کا مقابلہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مُغلیہ حکومت میں مسلمان مذہب، ایرانی پشتیں، اور فارسی زبان بھی غالباً قابلیت کے پیمانے ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ قابلیت کے یہ پیمانے صرف دروازے کھول سکتے ہوں۔ایک بات مسلّم ہے کہ مُغلیہ بادشاہوں کی حکومت میں کسی بھی عہدیدار کے لئے اپنی ذمّہ داریاں پوری نہ کرنے کا مطلب صرف نوکری سے برخاستگی نہیں ہوتا تھا جیسے کہ آج کل لوگ صرف ''لے آف'' (Layoff) ہو جاتے ہیں۔ بہرحال ہمارے اجداد میں سے کئی حضرات شہنشاہی حکومت کا حصّہ رہے۔ پھر انگریزوں نے ہندوستان کا راستہ دیکھ لیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ کافی بڑھی۔انگریزوں نے بہادرشاہ ظفر کو مٹیا برج میں قید کر دیا۔شہنشاہ کے ساتھ اس کے سارے وزراء بھی گرفتار ہوئے۔ ان وزیروں میں ایک وزیر ہمارے پردادا تھے۔ وزیر ہونے کے ناطے وہ بادشاہ اور چھوٹے عہدے کے لوگوں سے زیادہ جبر کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ان کا انتقال قید ہی میں ہوا، اور اس وقت ہمارے دادا اپنے بھائی کے ساتھ رامپور ہجرت کر آئے۔ایک اور بھائی آگرہ میں آباد ہوئے۔ ہمارے دادا یوسف علی خاں رامپور میں رہے۔ان کے نام میں خاں کا نام اس لئے تھا کہ انہیں خان بہادری کے خطاب ملا تھا۔ ہمارا ددھیال مغل تھا اور ماں کاظمی سیّد تھیں۔

ہمارے دادا کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھیں۔ بڑے بیٹے خورشید علی مرزا اور پھر ہمارے چچا نواب علی مرزا۔انہوں نے رامپور میں تعلیم حاصل کی اور پھر یہیں ملازمت کی۔ ہمارے نانا ڈاکٹر محمد علی کاظمی تھے اور والدہ کا نام افسری بیگم تھا۔ ہماری والدہ کی صرف ایک بہن تھیں، بھائی کوئی نہ تھے۔ یہ بھی لکھنؤ سے ہی آئے تھے۔ والد صاحب نواب رامپور جناب رضا علی خاں کے دور میں امام بارگاہ کے منصرم، یعنی کہ منتظم، تھے اور

سوز خوانی و مرثیہ خوانی بھی کرتے تھے۔اس کے علاوہ اوقاف، مصرفِ خیر، اور مقبرہ جاتِ شاہی، بمعہ مقبرہ جناب عالیہ، کے انتظامات بھی ان کی ذمہ داری میں آتے تھے۔ ہماری بھی اپنی اماں کی طرح صرف ایک بہن تھیں، کنیز فاطمہ، جو ہم سے بڑی تھیں۔ اس کے علاوہ دو اور بہنیں اور سات بھائی پیدا تو ہوئے، لیکن خُردعمری ہی میں انتقال کر گئے۔ان میں سے ایک بھائی اُس وقت پیدا ہوئے تھے کہ جب ہم ۴/سال کے تھے۔ یہ تقریباً نو ماہ کی عمر میں انتقال کر گئے۔ یہ ہمارے لئے بہت ہی صدمہ آمیز موقعہ تھا۔اس زمانے میں طبّی سہولتیں نہ تھیں اور بچّوں کے لئے پانچ سال کی عمر سے پہلے کی زندگی بہت دُشوار تھی۔ان وجوہات کی بنا پر ہماری پرورش بہت لاڈ و پیار سے ہوئی۔آدھی رات کو بھی جو فرمائش کی، وہ ہمارے ابّا نے پوری کی۔قمیضوں کی آستینوں کے بٹنوں تک میں پکھراج، زمرّد، فیروزے اور عقیق لگاتے، اور سونے کی زنجیریں اور ہیرے کی انگوٹھیاں پہناتے۔ ان ہی قیمتی تحائف میں سے کچھ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد کے شروع کے دنوں میں بہت کام آئے۔

رامپور کا گھر

رامپور ہندوستان کے اترّ پردیش کے صوبے میں نئی دہلی سے سوا سو میل کے فاصلہ پر ضلع مرادآباد میں واقع ہے۔ یہ مرادآباد سے بریلی کی ریلوے لائن پر ایک ریاست تھی، اور اب تقریباً ڈھائی لاکھ کی آبادی کا ایک شہر ہے۔رامپور میں کئی ڈگری کالج اور انجینئرنگ پولی ٹیکنک کالج ہیں۔

اپنے ریاستی دور میں اور ہماری رہائش کے دوران، رامپور کی حکومت نواب سر سید رضا علی خاں بہادر مستعد جنگ کے ہاتھ میں تھی۔ یہ ۲۰/جون ۱۹۳۰ء سے لے کر ریاست کے ہندوستان میں ضم ہونے تک نواب رامپور رہے، اور ۶/مارچ ۱۹۶۶ء کو اپنی وفات تک نواب کہلاتے رہے۔نواب رضا علی خاں ریاست کے گیارہویں اور آخری نواب تھے۔ان کی بیگم کا نام رفعت زمانی بیگم تھا۔ریاست کا رقبہ ۲۳۱۰/مربع کلومیٹر، یعنی تقریباً ۱۰۰۶/مربع میل تھا۔ریاستِ رامپور، ریاست کے پہلے حکمراں نواب علی محمد نے اٹھارویں صدی میں مغلیہ حکومت کے ساتھ مل کر ایک جنگ کے بعد قائم کی تھی۔ یہ ریاست، اس تاریخی جنگ میں فاتح مغلیہ حکومت کا ساتھ دینے کا انعام سمجھی جاسکتی ہے۔

ہندوستان ۔ آج کے نقشے میں اتر پردیش۔ پرانے وقتوں میں یونائیٹڈ پراونسز، اور قبلِ ازیں روہیل کھنڈ اور اودھ

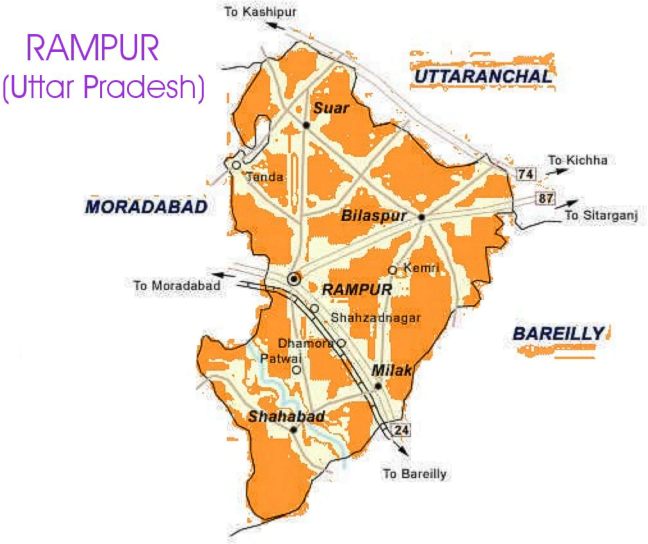

رامپور کے اطراف کا علاقہ

رامپور کی تاریخ تو بہت پرانی ہے، لیکن محض ایک راستہ کی حیثیت سے۔ اس راستے کے علاقوں

میں ۱۰۰۰ ؍ سال قبل بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کی جنگیں جاری تھیں۔ قطب الدّین ایبک اور شمس الدّین التمش کے بعد اس علاقہ پر کچھ عرصہ کے لئے راجپوتوں کی حکومت رہی اور یہ علاقہ ''کاٹھیار'' یا ''کٹھیر'' کہلاتا تھا۔ مسلمان پھر حملہ آور ہوئے اور ایک محترم بلکن نے ۱۲۵۴ء میں اس علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ افغانیوں کا اور خاص کر روہیلہ قبائیلوں کا گڑھ بنتا رہا، اور جنگوں کے بعد جنگیں ہوتی رہیں۔ ۱۷۲۱ء میں کٹھیر پر افغانستان کے روہیلہ قبیلہ کے سردار علی محمد خان روہیلہ نے راجہ ہرنشد کو شکست دے کر یہاں اپنی آزاد حکومت قائم کی، اور کٹھیر کا نام تبدیل کر کے روہیل کھنڈ رکھا۔ نواب کے خاندان والے ان صاحب کو اپنا پہلا نواب کہتے ہیں گو کہ کچھ لوگ نواب فیض اللہ خاں کو پہلا نواب کہتے ہیں جنھوں نے رامپور کی لائبریری بنائی جو بعد میں رضا لائبریری کہلائی۔ روہیل کھنڈ کی حکومت میں آنولہ، نجیب آباد، فرخ آباد، بریلی، شاہ جہاں پور، پیلی بھیت، مرادآباد، اور رامپور بڑے شہر تھے۔ ۱۷۷۴ء میں روہیل کھنڈ پر حافظ رحمت خان روہیلا کی حکومت کے وقت شجاع الدولہ نے برطانیہ کی برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوئے۔ روایت ہے کہ شجاع الدولہ نے انگریزوں کو ہتھیاروں اور جنگی مدد میں چالیس لاکھ روپے سکّہ رائج الوقت ادا کئے تھے۔ اس طرح روہیل کھنڈ انگریزوں اور اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے قبضہ میں آ گیا۔ انہوں نے روہیل کھنڈ کو اودھ سے ضم کر دیا، ماسوائے شہر رامپور، بلاس پور، آغاپور، مِلک اور پنوڑیہ کے علاقوں کے۔ ان علاقوں کو ملا کر ریاست رامپور قائم ہوئی۔

ریاست رامپور کے شہری علاقے شہر رامپور میں ہمارا گھر لبِ سڑک تھا اور سڑک کے دوسری طرف تھانہ لال قبر تھا۔ تھانہ کے قریب گھر ہونے کے دو فائدے تھے۔ ایک تحفّظ، اور دوسرا یہ کہ علاقہ کے سارے ناگوار واقعات کی خبر ہم تک پہلے پہنچتی تھی، جسے ہم نقصان بھی کہہ سکتے ہیں۔ تھانے میں جو پوچھ گچھ ہوتی، اس کی آواز ہمارے گھر میں آتی، کیونکہ ہمارا گھر بھی بڑے دالان کے ساتھ کھلا تھا، اور تھانہ دار کی آوازیں تو تہہ خانے تک میں پہنچ سکتی تھیں۔ شہری حقوق ابھی فیشن میں نہیں تھے۔ تھانے کی قربت کا ایک نقصان یہ تھا کہ ہم اونچی آواز میں نہیں بول سکتے تھے، اور ہلکے بولنے کی یہ عادت ہم سے اب تک نہیں گئی۔

رامپور کا ریاستی ماحول اور بہت پرانی رسمیں، اور اسی کے مطابق اس کا شہری نقشہ تھا۔ ہمارے والد کا گھر سہ دری والا مکان کہلاتا تھا، اور سامنے تھانہ لال قبر کے بائیں طرف لال قبر تھی۔ لال قبر کے سامنے

سے ہمارے گھر کے سیدھے ہاتھ کی طرف ایک پتلی سڑک جاتی تھی جس پہ آگے جائیں تو لال مسجد آتی تھی۔ گھر کے سامنے کی سڑک دائیں طرف کچھ آگے چل کر ملّا ظریف کی بذریا میں ختم ہوتی تھی۔ گھر کے سیدھے ہاتھ اور سڑک کے تھانے والے کنارے، لال قبر کے الٹے ہاتھ پر فرنگن کا گھر تھا جو کہ کبھی محل کہلاتا تھا لیکن اس وقت تک اس وسیع عمارت کے صرف ٹوٹے پھوٹے آثار رہ گئے تھے۔ اس محل کے ساتھ ''فرنگن کی گلی'' تھی، چھوٹی اور پتلی سی، جو آگے جا کر چوڑی ہوتی ہوئی، نواب رامپور کے قلعہ کے اطراف سے ہوکر جامعہ مسجد کے سامنے کی سڑک پر ختم ہوتی تھی۔ جامع مسجد اوپر کی منزل پر تھی، اور اس کے نیچے بازارِ نصراللہ خاں کی دکانیں تھیں۔ اسی بازار میں ہمارے والد صاحب کی دُکان اور ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جس میں چند ملازمین کام کرتے تھے۔ جامع مسجد کے دایئں ہاتھ پر تحصیل کا دفتر، اور اس دفتر کے اوپر صولت لائبریری تھی۔ اسی طرف سڑک پر آگے چل کر گنج تھا جہاں تھوک پر سامان بکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہفتے میں تین دن توپ خانہ دروازہ کے میدان میں ''پینٹھ'' لگتی تھی جو کراچی کے جمعہ بازار، اور نیویارک کی نئی اشیاء کی فلی مارکیٹ جیسا بازار ہوتا تھا۔

رامپور ۔ نصراللہ خاں کے بازار میں واقع جامع مسجد

گنج بازار کے نام پر گنج محلّہ بھی تھا، اور دوسرے محلّوں کے نام بھی خالصۃً رامپوری طرز کے تھے، جیسے کہ کٹکیّاں، مدرسہ، نالہ پار، کیتھ کا پیڑ، طوغوں کا گھیر، مردان خان کا گھیر، مدرسہ محلّہ بازار، شاہ آباد دروازہ، نواب دروازہ اور نکٹی جیانی کا تھانہ، وغیرہ۔ گھیر دراصل ایک چاردیواری کے اندر محفوظ محلّے کو کہتے تھے۔ اس طرح کے گھیر میں پندرہ کے قریب گھر ہوتے تھے۔ ایسے چاردیواری والے محلّے میں آگے اور پیچھے صرف دو دروازے ہوتے تھے۔ یہ مت پوچھیں کہ نکٹی جیانی کا نام کیسے آیا، کہ ہمیں بھی خبر نہیں۔ محلّہ نالہ پار جانے سے لوگ کتراتے تھے کہ وہاں بات بات پر چاقو نہ صرف نکلتے بلکے جوش وخروش سے استعمال بھی ہوتے۔ اسی لئے شاید اس شہر میں چاقو بہت اچھے بنتے تھے، اور اس کے علاوہ قینچیاں، سروطے اور حامد کیپ

نامی ٹوپیاں بھی بہت اچھی بنتی تھیں۔ حامد کیپ مولانا محمد علی جوہر کی والدہ اماں بی کی بنائی ہوئی الٹی کشتی نما ٹوپیاں تھیں جو نواب حامد علی خاں کے زمانے میں شروع ہوئی تھیں۔ یہ ململ یا مخمل کی بنتی تھیں۔شہر میں پکّے مکان بھی تھے اور کچے بھی، لیکن سارے مکان کُشادہ تھے۔ پکّے مکان چھوٹی لال اینٹ سے بنتے تھے، اور یہ اینٹیں ہزارہ کی اینٹیں کہلاتی تھیں۔گلیاں کھرونچے، یعنی چوکے کی اینٹ سے بنی تھیں۔فوجیوں کے لئے بنگلے بہت اچھے بنے ہوتے تھے جن میں بجلی، پانی اورفلش سسٹم کا انتظام تھا، جوکہ اُس وقت سے بہت آگے کی سہولتیں سمجھی جاتی تھیں۔انہی میں سے ایک بنگلے میں ہم شادی کے بعد جاکر رہے تھے۔

ہرروزگلیوں کی نالیوں اور نالوں میں بہشتی فنائل ملا پانی بہاتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے لے کر خاص باغ تک کی تمام بڑی سڑکوں پر پانی کےٹرک روزآنہ چھڑکاؤ کرتے تھے۔ ان بڑی سڑکوں پر شام سے لیمپ جل جاتے تھے۔ یہ لیمپ نواب صاحب نے بالکل بکنگھم پیلیس کے ڈیزائین کے مطابق بنوائے تھے۔بجلی کے استعمال میں آنے سے پہلے ان میں مٹی کے تیل، یعنی کیروسین کا استعمال ہوتا تھا۔سب سے چوڑی سڑک ایک نئی سڑک تھی جس کا نام اور کیا رکھنا تھا بس راہِ رضا رکھا، کہ ہر بڑی چیز پرنواب صاحب کا نام ہوتا تھا۔لیکن کیونکہ یہ چوڑی سڑک ۶۵ رفٹ چوڑی تھی، اس کا نام پینسٹھ فٹی زبانِ عام ہوا، اورکوئی اس کوراہِ رضا نہیں کہتا تھا۔اسی سڑک پرآگے جاکر داہنی طرف خاص باغ آجاتا تھا اور ریلوے اسٹیشن بھی راہِ رضا پر خاص باغ کے برابر ہی تھا۔قریب ہی ایک بازار بھی تھا۔سڑک کے ساتھ ساتھ خاص باغ کی باڑھ تھی، اوراندر رہائشی حصّہ کی طرف جانے کے لئے راستہ بنا تھا جس پر سڑک کے بجائے سرخ رنگ کی بجری پڑی تھی۔اس پر چلیں تو ہرقدم پر چرر چرر کی آواز آتی تھی۔

نواب رضا علی خاں کی اپنی ہر چیز برطانیہ سے آتی تھی۔کپڑے لندن کے سلے ہوئے ہوتے تھے، اورتو اور دھوبی تک کولندن سے تربیت دلوائی تھی۔ان کے بچوں کی نرسنگ کا عملہ بھی انگریز عورتوں پر مشتمل تھا، لیکن اس کے باوجود ہرایک کوانگریزی کے علاوہ اردو، فارسی اورعربی زبانوں کی تعلیم بھی ملتی اورقرآن پڑھایا جاتا تھا۔ پھرسب اہلِ تشیع تو تھے ہی۔ دوسری طرف یہ سب گھڑسواری، نیزے بازی،تلوار بازی، اور بندوق سے نشانہ بازی بھی سیکھتے تھے۔ان کی لڑکیاں کھانا بنانا بھی سیکھتی تھیں اورگھر کے دوسرے کام کاج بھی۔نواب صاحب کے ایک بیٹے کی بیگم جوراجہ پیر پور کی بیٹی تھیں اپنے کھیتوں اور باغات کی زمینوں کے معائنہ کے لئے

خود جاتی تھیں۔ نواب صاحب کے ایک صاحبزادے کے بارے میں خبر تھی کہ انہوں نے ریاست کے ہندوستان میں ضم ہونے کے دوران لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اے۔ڈی۔سی کی حیثیت سے ایک سال تک کام کیا، اور اس دوران اپنے والد کی اُس خصوصی ٹرین میں رہائش اختیار کی جو نواب رضا علی خاں نے اپنے سفر کے لئے ایسے ہی اہتمام سے بنوائی تھی جیسے کہ آج کے دور میں امریکی صدر کے لئے ''ایئر فورس ون'' طیّارہ ہے۔ یہ ٹرین کچھ ڈبّوں پر مشتمل تھی اور جب نواب کو سفر کرنا ہوتا تھا تو یہ ڈبّے عموماً عام سواریوں کی ایکسپریس ٹرین سے جوڑ دیئے جاتے تھے۔ اب نواب کو جہاں اُترنا ہوا، ٹرین وہاں روکی جاتی تھی، خواہ ایکسپریس ٹرین کا وہاں رکنا شیڈول میں ہو یا نہ ہو۔ ہر اسٹیشن پر اس طرح کے ڈبّوں کے ٹھہرنے کے لئے ایک علیحدہ حصہ بنا ہوتا تھا۔

رامپور ۔ قلعہ کے اندر محل سرا

نواب رضا علی خاں کو ہر نئی چیز اور تاریخی چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ ہر طرح کی گھڑیاں، بت، ریڈیو، اور کاریں رکھتے تھے، اور ہر روز ایک مختلف کار میں سیر کرتے تھے۔ ہم نے ان کے پاس طرح طرح کی کاریں دیکھیں۔ پرانی کاروں کا ایک میوزیم بنا رکھا تھا۔ جنگ کے زمانے کے کئی مختلف ادوار کے جنگی ہتھیاروں سے کوٹھی کا ایک پورا بلاک سجا ہوا تھا، اور ہتھیاروں کی مناسبت سے ہی بُت لگے ہوتے تھے۔ ان کی محل نما کوٹھی کے بلاک A میں ان کے اپنے رہائشی علاقہ میں فرش ایسا تھا کہ عام جوتوں میں چلیں تو پیر پھسل جائے۔

یہ تو تھیں نواب کے محل نما گھر کی باتیں۔ اب بتائیں ہم آپ کو اپنے گھر نما محل کے بارے میں کہ ہمارا گھر بہت کشادہ تھا۔ باہر ایک بڑا سا برآمدہ جسے ڈیوڑھی کہتے تھے، اور اسی طرح اندر ایک

برآمدہ۔اندرونی برآمدہ پر چھت تھی ۔ یہ کوئی پچاس فٹ آگے ایک کھلے اور بہت بڑے صحن سے ملتا تھا۔گرمی کی بارشوں میں سب لوگ پلنگ برآمدہ میں اس طرح ڈالتے کہ اس کا آدھا حصہ برآمدہ میں اور آدھا صحن میں ہوتا،اور ہم پلنگ پر لیٹ کر پیر بارش کی پھوار میں گیلے کرتے ۔لیکن جب بجلی کی چمک اور بادل کی گرج ہوتی تو اماں کے پاس ان کے بستر میں غڑپ سے جا دبکتے تھے۔صحن میں امرود اور انار کے درخت لگے تھے، زرد چنبیلی تھی اور بہت ساری سبزیاں بھی تھیں۔ زرد چنبیلی وہاں کے بعد ہمیں کہیں نظر میں نہ آئی، اور ایک مرتبہ ہم نے رامپور سے راولپنڈی لانے کی کوشش بھی کی تو اس کا پودا کسٹمز کی چھان پھٹک میں ضائع ہوگیا۔

صحن میں پکّا فرش نہیں تھا، اسی لئے ہر شام والد صاحب کے آنے سے پہلے ہم صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کرادیتے۔ والد صاحب کو ہم ''ببّا'' کہتے تھے۔ رہائشی کمروں سے تقریباً تین سوفٹ دور باورچی خانہ اور غسلخانہ وغیرہ تھے۔اس کے قریب ہی ایک کنواں تھا۔اس کنویں سے ہم پینے کا پانی نکال کر مٹی کے گھڑوں اور صراحیوں میں رکھتے تھے جن میں گرمیوں میں پانی بہت ٹھنڈا رہتا تھا۔گھڑوں اور صراحیوں کے منہ پر سفید ململ کا کپڑا باندھ کر رکھنا ہوتا تھا تاکہ اس میں گرد اور کیڑے نہ جائیں۔کبھی پھولوں کے ہار اس کپڑے کے اوپر باندھ دیتے تھے۔ دالان کے دوسری طرف ایک سائے دار برآمدہ تھا جس میں ہم اپنی ناگوری گائے باندھتے تھے۔جس وقت چاہا دودھ خود ہی دوہا اور جھاگ سمیت پی لیا۔پھر ہماری والدہ گرمیوں کے دوران صبح کو چاندی کے ورق میں لپٹی ہوئی رسوت کی گولیاں دودھ کے ساتھ پلاتی تھیں کیونکہ چاندی کے ورق سے رسوت کی کڑواہٹ چُھپ جاتی تھی۔ دوسری طرف گرمیوں میں ہمیں رسوت میں رنگے کپڑے پہنائے جاتے تاکہ گرمی دانے نہ نکلیں۔گھر کے دالان کے ایک طرف کی دیوار میں کھڑکی تھی ،جس میں کواڑ یا دروازے جیسے پٹ لگے تھے۔اگر پڑوس میں کسی کے گھر جانا ہوا تو انہی کھڑکیوں کے ذریعے ایک گھر سے دوسرے گھر ہوتے چلے گئے۔زیادہ فاصلے پر جانا ہوا تو ڈولی منگالی جسے کہار اپنے کندھے پر رکھ کر ہمیں ہماری منزل تک پہنچاتے، اور ہماری واپسی کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔کہاروں کے پیسے فاصلہ کے حساب سے پہلے ہی سے طے کر لئے جاتے تھے۔کہار آتے تو ڈولی کو ڈیوڑھی میں رکھ کر باہر چلے جاتے تاکہ خواتین اُن سے پردے میں رہ کر ڈولی کے اندر بیٹھ جائیں، یا خواتین ڈولی سے اتر کے گھر کے اندر چلی جائیں اور کہار کو آواز دے دیں کہ وہ ڈولی لے جائے۔

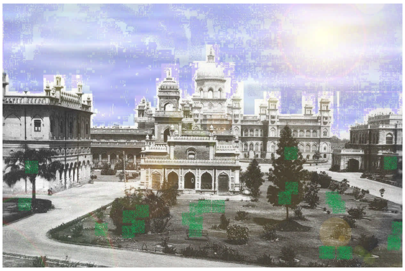

رامپور، ۱۹۴۵ء ۔ قلعہ میں حامد منزل، دور کا منظر

رامپور کی سب سے مشہور عمارتیں وہاں کا قلعہ اور رضا لائبریری تھیں ۔ روز آنہ قلعہ کے گیٹ پر شام کے پانچ بجے محافظوں والی روشن چوکی پر نفیری اور نقریاں بجتی تھیں ۔اس سے ملازمین کو دستہ بدلنے کے وقت کی اطلاع ملتی ، کہ کچھ لوگ کام ختم کر کے گھر جاتے ، اور کچھ اب کام کرنے کے لئے آتے ۔انگریزی میں اسے ''چینج آف گارڈ'' کہتے ہیں ۔شام کے ۶/ بجے قلعہ کا بڑا دروازہ سب کے لئے بند ہو جاتا تھا، اور ایک چھوٹا دروازہ کھلا رہتا تھا جو صرف خاص لوگوں کے لئے تھا ۔

رامپور ۱۹۷۹ء ۔ رضا لائبریری (قلعہ کے اندر) ۔تصویر میں حضرات ہمارے بھانجے ہیں ۔

حامد منزل میں رضا لائبریری ۱۷۷۴ء میں رامپور کے دوسرے نواب فیض اللہ اور تیسرے نواب محمد علی کے زمانے میں قائم ہوئی تھی ۔اس وقت یہاں ۱۵۰۰۰/ (پندرہ ہزار) اردو، فارسی، اور ترکی کی اہم تاریخی کتابیں موجود ہیں، جس میں حضرت علیؑ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی قرآنِ پاک کی ایک جلد بھی ہے ۔

یہاں امام احمد غزالی اور مغلیہ بادشاہوں کی ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں بھی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ رضا لائبریری میں مغلیہ دور کی نہایت چھوٹی پینٹنگ تھیں اور اب بھی ہیں۔ اس لائبریری کی اکثر کتابوں کو ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد انگریزوں نے چرا لیا تھا اور انہیں یورپ اور ایشیا کے مختلف ملکوں میں بیچ دیا، جن میں وسطی ایشیا کی ترکستانی مملکتیں بھی شامل تھیں۔ رامپور کے آٹھویں نواب، نواب کلبِ علی نے ان میں کی اکثر کتابوں کو منہ مانگی قیمت ادا کر کے واپس جمع کیا۔ پھر ان کے پوتے نواب رضا علی خاں نے مزید اضافہ کیا۔ یہ لائبریری اب تاریخی سرمایہ اور قومی ورثہ کی حیثیت سے ہندوستانی حکومت کے ماتحت کام کر رہی ہے۔

اب اس کے علاوہ اور کیا تھا رامپور میں۔ تو جناب وہاں ایک سنیما ہال تھا ''کورونیشن ٹاکیز''۔ نام تو ٹاکیز تھا، لیکن فلمیں وہاں خاموش چلتی تھیں۔ کچھ تو فلموں میں بھی آواز نہیں ہوتی تھی اور کچھ سنیما میں آواز کا انتظام بھی نہیں تھا۔ پھر دوسرا سنیما بنا جس کا نام ''ناہید سنیما'' رکھا گیا۔ یہ نواب رضا علی خاں کی بیٹی کے نام سے موسوم تھا۔ ریاستی ماحول تھا، لہٰذا ہر عمارت میں نوابی خاندان کا نام ہوتا تھا، جیسے کہ رضا لائبریری، مرتضیٰ اسکول، قمر القا اسکول برائے دختران، رضا انٹر کالج، اور صولت لائبریری۔ صولت لائبریری کو صولت علی خاں نے قائم کیا تھا۔ دوسرے مقامات میں فری میسن ہال، ایک مرتضیٰ انفنٹری، ایک رضا انفنٹری، اور آرٹیلری میدان، ایک آرمی کنٹونمنٹ اور لانسر تربیت کے لئے ایک بڑا میدان تھا۔

رامپور: آرٹیلری میدان (۱۹۴۶ء)

اس زمانے میں رامپور کی سب سے بڑی فصل گنّا تھی۔ نواب رامپور کے بریلی سے لے کر رامپور تک گنّے کے کھیت تھے، اور گنّے کے طرح طرح کے پکوان عام خوراک میں تھے۔ اس میں خاص طور پر رساول

قابلِ ذکر ہے۔ یہ ایک حصّہ چاول اور چار یا پانچ حصّہ گنّے کے رس میں پکی ہوئی کھیر ہوتی ہے۔ دوسرے گڑ اور گنڈ ورے وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ جب ہم نے کیلیفورنیا کے شہر گلرائے کے بارے میں سنا کہ یہاں لہسن اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ یہاں لہسن کی آئسکریم بھی ہوتی ہے، تو ہمیں رامپور کے گنّے کے پکوان یاد آ گئے۔

تو یہ تھا رامپور، کہ جہاں سے نواب حامد علی خاں کی مخمل سے بنی ہوئی حامد کیپ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، اور بی اماّں بھی مشہور ہیں۔ اور یہیں سے سید ذاکر علی خاں اور فلمی اداکار محمد علی بھی تھے۔ ذاکر علی خاں نے کراچی میں علی گڑھ یونیورسٹی آف انجینئرنگ وٹکنالوجی کی بنیاد ڈالی جو مکمل ہونے کے بعد اب کراچی کی ایک اعلیٰ تعلیم گاہ ہے۔

ہماری تعلیم

ہماری اپنی رسمِ بسم اللہ ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ پھر بڑی بہن کی شادی ۱۱ر نومبر ۱۹۳۵ء بمطابق ۱۴ر شعبان ۱۳۵۴ھ کو ہوگئی۔ اِس شادی کے بعد ہمارے عزیز رشتہ دار آتے جاتے رہے اور وقت اچھا گزرا، ورنہ تو ہم اپنے گھر میں بہت اکیلے ہو جاتے۔ لال قبر کے علاقے میں ہمارے گھر سے دو گھر چھوڑ کر ہماری ایک رشتہ کی خالہ عابدہ بیگم کاظمی کا مکان تھا۔ انہوں نے اپنے گھر میں رات کا اسکول کھولا تھا جو رات کے ۱۱ر بجے تک چلتا تھا۔ یہ ان اسکولوں میں سے ایک تھا جو تعلیمِ بالغاں کے نام سے کئی گھروں میں شروع ہو گئے تھے، اور ہم بات کر رہے ہیں تقریباً ۱۹۳۵ء کی۔ یہ مدرسہ جات انہوں نے کھولے تھے جو چراغ سے چراغ جلائے رکھنے کا عزم رکھتے تھے اور اُن کے لئے تھے جو دن میں بوجہ مجبوری پڑھ نہیں سکتے تھے۔ اسکول کے وقت اپنا گھر اسکول کے لئے خالی کرنے کی ضرورت کے تحت ہماری خالہ اور اُن کے بچّے ہمارے گھر آ جاتے اور ہم اُن کے ساتھ ان گھنٹوں میں اپنی تختی کی لکھائی مکمل کرتے، جس کی تربیت کے لئے ہمارے چچا شام کو آتے تھے۔ ہمیں خوش نویسی ایک ماموں سکھاتے تھے۔ لڑکیوں کے لئے سب عزیز کچھ نہ کچھ وقت نکالتے تھے کہ وہ بھی پڑھ جائیں، کیونکہ گھر سے باہر جانا اور اسکول میں پڑھنا ابھی اس علاقے میں عام نہیں تھا۔ کم عمری میں تو ہم اپنے بچوں والے کپڑوں میں بّبا کے ساتھ باہر نکل جاتے تھے۔ لیکن جب تھوڑے بڑے ہوئے تو ہمارے والد نے ہمیں باہر لے جاتے وقت شیروانی اور صافہ باندھ کر لے جانا شروع کر دیا۔ ہم ان کی سائیکل پر لڑکوں کی طرح باہر نکلتے اور لوگ یہی سمجھتے رہے کہ ہمارے بّبا کا ایک لڑکا بھی تھا۔ اس سے ہم خود صافہ باندھنے کے ماہر ہو گئے اور

اپنے بیٹوں کی شادی میں اس ہنر کو استعمال کیا۔ لیکن کچھ سالوں بعد باہر جانے کی یہ سہولت بھی ختم ہوگئی تھی۔

گھر میں تعلیم لینے کے کچھ فائدے بھی ہوئے۔ ہماری شروع کی تعلیم تو یہ سمجھیں کہ جُھولے میں ہوئی۔ گھر کے دالان میں ایک جُھولا تھا جس میں ایک چھوٹا سا کھٹولا پڑا ہوا تھا۔ جُھولے اکثر گھروں میں ہوتے تھے۔ چھوٹے بچوں کے لئے لکڑی کے پالنے اور نواڑ سے بُنے ہوئے چھت سے ٹانگنے والے جُھولے ہوتے تھے، ایسے کہ ان میں بچے کو ڈزنی لینڈ کے جُھولوں کا مزہ بچپن سے ہی آجائے۔ ہمارے جُھولے میں جُھولنے کے لئے کوئی بچہ نہیں تھا، ہم ہی چھوٹے تھے۔ ہم نے اسی جُھولے میں اسلامیات یاد کی، سارے قرآنی سُورے زبانی یاد کئے، اور پھر جیسے جیسے بڑے ہوئے تو اسی جُھولے میں ادب کو پڑھا۔ ان میں انشاء کے خطوط سے خط لکھنا سیکھا جن میں یہ لمبے چوڑے القاب ہوتے تھے۔ ہمارہ پسندیدہ تھا، " جناب قبلہ والد محترم دام ظلہم ملکھم "، جس کی استعمال کی ہمّت ہمیں آج تک نہ ہوئی۔ یہی لکھتے پڑھتے اسی جُھولے میں امّاں نے ہمیں فارسی کی کتابیں دیں کہ ’’لو بیٹی سبق دیں، تم اسے جُھولے میں یاد کرلو‘‘۔ جُھولے میں ہم لمبے سُروں میں گنگناتے ......

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری

یا......

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

اور جگنو کی وہ نظم ......

سناؤں تمھیں بات ایک رات کی
کہ وہ رات اندھیری تھی برسات کی
چمکنے سے جگنو کے تھا ایک سماں
ہوا پر اڑیں جیسے چنگاریاں
وہ جھم جھم چمکتا اِدھر سے اُدھر
پھرا کوئی رستہ نہ پایا مگر

اسی کھٹولے والے جُھولے پر پینگ لیتے لیتے جب ہم اماں کے قد کے برابر ہونے لگے تو والدہ

نے کہا، ''بیٹی ہر چیز جُھو لے کے لئے نہیں ہوتی، کچھ تخت پر بیٹھ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے''۔ غرض ایک پنجابی لطیفہ کے مطابق وہ جُھولا ''کمبل'' ہو گیا تھا۔ رات کا جُھولا چھڑانے کے لئے ہماری ایک رشتہ دار خاتون نے ہم سے کہا کہ ''بیٹا رات کو جُھولا نہیں جُھولتے کیونکہ رات کو جُھولا پریوں کا ہوتا ہے، وہ کہاں جھولیں گی''۔ ہم پھر اماں سے سوال کرتے کہ ''یہ پریوں کو ہمارا جُھولا کیوں پسند ہے؟ ہم کہاں جُھولیں، وہ تو پریاں ہیں کہیں اور جا کر جُھول سکتی ہیں''۔

غرض رات کا جُھولا جُھولنا چھوٹا تو دوسری کتابوں کے لئے زیادہ وقت ملنے لگا، اور ہماری والدہ نے ہمیں مختلف موضوعات پر مزید کتابیں دیں۔ ہمارا کوئی بھائی تو نہ تھا، صرف ایک بڑی بہن تھیں۔ خالہ زاد اور ماموں زاد بھائی تھے جو اسکول کے بعد ہمارے گھر کے بڑے دالان میں کھیلتے اور امرود اور انار کے درختوں کے پھلوں کے حصے بخرے ہوتے۔ اس دوران میں ہم اُن کی کتابوں سے تعلیم حاصل کرتے۔ اسی طرح اسماعیل میرٹھی اور ڈپٹی نذیر احمد کی کتابیں پڑھیں، مراۃ العروس اور توبۃ النصوح خاص کتابیں لگیں۔ ان کتابوں میں لکھے اشعار کو لہک لہک کر پڑھتے، مگر آواز نزدیکی تھانہ لال قبر کی وجہ سے بہت نیچی رکھنی پڑتی تھی۔ ہماری اماں کہتی تھیں کہ ''زبان شیریں تو ملک گیری، زبان ٹیڑھی تو ملک بانکا''۔ پھر اماں کی سنائی ہوئی ہر کہانی میں تعلیم کا پہلو آنے لگا۔ ہم اپنی شادی تک اماں کے پاس سوتے رہے اور ان سے کہانی سنتے رہے۔ اماں کو بھی ہزار داستان کی ساری کہانیاں یاد تھیں، اور انھی کہانیوں کے ساتھ وہ قصّہ چہار درویش کے ساتھ اصولِ دین، فروعِ دین، نمازیں اور اسلامی تاریخ سکھا دیتی تھیں۔ یعنیٰ یہ کہانیاں بغیر قیمت نہیں تھیں۔ اماں بتاتی تھیں کہ انھوں نے اور ان کی واحد بہن نے اپنے بچپن میں تختی پر مٹّی کے چاک سے لکھنا سیکھا۔ اس کام میں تختی دھونا اور پنڈول کی لپائی کرنا بھی شامل تھا۔ ہم نے بھی اسی طرح لکھنا سیکھا۔ ہماری اور اسی طرح اُس زمانے کے اکثر لوگوں کی خوش خطی کی اب تک تعریف ہوتی ہے۔ آج کل ہمارے بچّوں کی اولادیں کاغذ کے ایک طرف لکھ کر اُس کاغذ کے دوسری طرف لکھنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ہمارے بچپن میں لڑکیوں کے اسکول شروع ہو چلے تھے۔ لڑکیاں اسکول اکّوں اور تانگوں کے علاوہ ٹھیلوں پر بھی جاتی تھیں۔ لیکن ہمارے بزرگوں کی وضع داری نے ہمیں اسکول جانے سے روکے رکھا، اور ساری تعلیم گھر میں ہی ہوئی۔

اس وقت ہمارے واقف کار امتیاز علی عرشی رضا لائبریری کے منتظم (لائبریرین) تھے۔ اس وجہ

سے ہمیں نایاب کُتب بھی مل جاتی تھیں ۔ پھر بہن کی شادی کے بعد ہمارے دولہا بھائی نے بھی بہت کتابیں لاکر دیں ۔ ہم بھی پڑھنے کے ایسے شوقین کہ رات رات گئے چاند کی روشنی میں بھی کتاب پڑھتے ،اور یہی چیز ہم نے اپنے بچوں میں بھی دیکھی جو چاند کی روشنی میں پڑھتے پڑھتے چشمہ لگا بیٹھے، گو ہم چشمہ سے بچے رہے ۔ ہمارے زیر مطالعہ جو کتب و رسائل آتے ، وہ پہلے والدہ اور بڑی ہمشیرہ پڑھتی تھیں ۔ زیادہ تر تاریخ اسلام اور کُتبِ حدیث ہوتیں ، لیکن کبھی کبھی کچھ رسالے بھی مل جاتے ۔ درحقیقت ہمیں شادی کے بعد ہی کافی وسیع حلقہ کے شاعر اور نثر نگار حضرات کو پڑھنے کو ملا ۔ یہ یاد رہے کہ ہماری شادی چودہ (۱۴) سال کی عمر میں ہوئی ، جو ایسی عمر ہے کہ اب لڑکیاں نویں جماعت میں داخل ہوتی ہیں ۔اور پھر تو ہم نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی ۔ ٹیگور ، غالب اور اقبال سے لے کر ڈیل کارنیگی (Dale Carnegie)، سب کو ہی پڑھ ڈالا ۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ ہم نے کراچی یونیورسٹی کے طالب علموں کو وہ کتابیں پڑھ کر ایم ۔اے ۔ کی ڈگری لیتے دیکھا کہ جن کتابوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں زمانہ بیت چکا تھا ۔ بچپن کی عادتیں مشکل سے ہی جاتی ہیں اور ابھی بھی کچھ پڑھے بغیر سونا ذرا مشکل ہوتا ہے ۔ اسی لئے ہم سب کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ بچّوں کا دماغ اور فطرت کم عمری ہی میں سنوارو ۔

ہماری والدہ کے پاس محلّے کی لڑکیاں اردو ، فارسی اور قرآنِ پاک پڑھنے آتی تھیں ۔ انہی میں ہماری دوست اچھی بیگم عرف اَچھو تھیں جو ہمارے ایک چچا کی طرف کی رشتہ دار ہوتی تھیں ۔ یہ روز آنہ اپنی بُوا کے ساتھ آتی تھیں ۔ ان کی اس نگہباں کا نام عباسی بُوا تھا اور یہ صاحبہ اَچھو کی امی کے ساتھ ان کی شادی پر میکہ سے آئی تھیں ۔ پڑھائی کا انداز کچھ ایسا تھا کہ صبح نو سے گیارہ تک قرآنِ پاک ، پھر ایک بجے تک اردو ، ظہر کی نماز ، پھر فارسی اور سینے پرونے کی تعلیم ۔ والدہ صاحبہ اس کام کا کوئی معاوضہ وغیرہ نہیں لیتی تھیں کیونکہ سب ایک دوسرے کی مدد کے لئے چراغ سے چراغ جلائے رکھنے کے خیال سے ایک دوسرے کے کام آتے تھے ۔ رامپور اسکول کے ہیڈ ماسٹر وزیر احمد بریلوی کی بیگم نے خواتین کی پہلی انجمن شروع کی اور ایک روپیہ ماہانہ چندہ رکھا جس سے کہ لڑکیوں کے لئے کتابیں وغیرہ خریدی جاتیں تھیں ۔ یہ ہر گھر میں ڈولی میں جاتیں اور ممبر بناتیں ۔ انہوں نے بڑی تعداد میں ممبر بنائے تھے اور ان کی ڈولیوں کے کہار اِن کی ہمت کے گواہ تھے کہ اُن کہاروں کے کندھے پر ہی وہ ڈولی جاتی تھی ۔ ہمیں ہماری اس عمر میں ''خزانچی'' چنا گیا تھا ۔ غرض جمعہ کی چُھٹی ہوتی تھی اور اس دن ہم گُڑیا گڈے کی شادی ، بارات ، سالگرہ ، اور کتنی ہی اور تقریبات کرتے تھے ۔

ہمارے پاس درجنوں گُڑیاں تھیں، اور پھر بہت سی گُڑیاں جو ہماری دادی نے ہماری بڑی بہن کے لئے بنائی تھیں، وہ بھی ہمیں ملیں۔ بعد میں ہماری خالہ زاد بہن نے بھی ان میں سے کچھ گُڑیوں سے کھیلا۔ ان ہی میں سے کافی گُڑیاں ہم نے جمع کیں اور اِن سے کئی سال بعد کراچی میں ہماری بیٹیاں بھی کھیلیں جو بھائیوں سے زیادہ دیر تک نہ بچیں۔ ہم نے اپنی پوتیوں کو جب نیو یارک اور کیلیفورنیا میں ایسی گُڑیاں دیں اور بنانا سکھایا تو اُن کے اسکول کی اُستانیوں تک سے ان گُڑیوں کے لئے درخواستیں آ گئیں۔ لیکن رامپور کے بچپن میں گُڑیوں کی تو اپنی شادیاں اور دوسری خاندانی رُسومات تک ہوتی تھیں۔ ان کی تقریبات میں سب سہیلیاں جمع ہوتیں، کھانے پکتے، ہر نوعیت کے کپڑے سلتے، اور رخصتی اور منہ دکھائی سمیت تمام رُسومات ہوتیں۔ حد یہ کہ کھانا مسجد میں جاتا، اور گُڑیوں کی نماز پردے میں اور گڈوں کی نماز سے الگ پڑھائی جاتی۔ کھیل ہی کھیل میں اس طرح نئی نسل بالکل ایسی ہی ہو جاتی جیسی کہ پچھلی نسل تھی۔ بیرونی اثرات بہت کم تھے، اور ٹیلی ویژن نہ ہونے کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اب بچوں کی آدھی سے زیادہ تہذیب اور تعلیم ٹیلی ویژن کے کارٹون اور دہشت انگیز فلموں سے بنتی ہے، گو کہ کچھ چیزیں غالباً فطرت میں آتی ہیں۔ ایسے ہی اپنے نواسے جعفر کو امریکی سکّے کوارٹر جمع کرتے دیکھ کر ہمیں یاد آیا کہ تقریباً ساٹھ سال پہلے ہم ہندوستانی چوّنیاں جمع کر کے خوش ہوتے تھے۔

مذہبی روایات

مذہبی روایات پورا کرنا اور مذہبی اہم دنوں کو یاد کرنا اہم تھا۔ کچھ تو شیعہ نواب کی طرف سے زور وشور رہتا تھا، اور کچھ دوسری مذہبی قوموں سے دین داری اور ایمان کا مقابلہ بھی تھا۔ رجب میں کونڈے ہوتے بڑے زور شور کے۔ ہر چیز مٹّی کے برتنوں میں رکھتے تھے، کھیر سے لے کر ہر طرح کے حلوے اور پُوریوں تک۔ مٹی کے ان برتنوں میں کھیر بہت سوندھی ہو جاتی تھی۔ شبِ برأت پر رات کو چراغاں ہوتا، اور ہر طاق میں دیئے روشن ہوتے۔ پرانے گھروں میں طاق بہت ہوتے تھے، اور چھوٹے، بڑے ہر پیمانے کے ہوتے تھے۔ موسم سے بچاؤ کے لئے گھروں کی دیواریں خوب چوڑی ہوتی تھیں کیونکہ ایئر کنڈیشننگ وغیرہ تو تھی نہیں۔ ان دیواروں میں ایک الماری سی کٹی ہوتی تھی، جو اگر بغیر دروازے کی ہوئی تو اسے طاق کہتے تھے۔ کچھ لوگ جھنجی میں چراغ روشن کرتے تھے۔ جھنجی کُلیا کی طرح کا ایک برتن ہوتا تھا اور اس میں سوراخ ہوتے تھے جس سے روشنی باہر آتی تھی، جیسے کہ امریکہ میں گول کدو کو کاٹ کر ہالوین میں روشنی کرتے ہیں۔ کلیا

مٹی کا گول برتن ہوتا تھا۔ اسی کلیا میں بارہ وفات کے میلاد میں لڈو رکھ کر اوپر سے ایک ڈھبریا سے ڈھکا جاتا، اور اِس طرح سے یہ حصّے تقسیم ہوتے تھے۔ پھر انہی کلیوں میں محرّم میں کھیر یا حلیم باٹی جاتی تھی۔ ویسے عام دنوں میں چینی، مٹّی چینی یعنی سِرامک، اور بلّور یعنی شیشے کے برتن استعمال ہوتے تھے، اور اس کے علاوہ بڑے برتن جیسے کہ ڈونگے، چمچے، پاندان، اور تسلے وغیرہ تانبے اور چاندی کے ہوتے تھے۔ اچھے برتنوں اور شادی کے برتنوں پر لوگ اپنے نام بھی کُھدوا لیتے تھے۔ خاصدان، اُگالدان، اور گُلدان بھی مختلف دھاتوں کے ہوتے جن پر طرح طرح کی دستکاری کی گئی ہوتی تھی۔ کہتے تھے کہ اُگالدان پر کوئی شخصیت اپنا نام نہیں لکھواتی تھی۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ میں تو اُلٹا ہی حساب دیکھا کہ یہاں تو ٹوائلٹ کی ہر چیز پر بنانے والے کا نام فخر سے لکھا ہوتا ہے۔

رمضان میں سحری کے وقت ''جگانے والے'' آتے تھے، جو ڈھول بجا بجا کر سب کو جگاتے۔ الارم والی گھڑیاں شاید ابھی ناپید تھیں۔ ہم چھوٹے تھے، روزہ تو نہیں رکھ سکتے تھے، لیکن ڈھول کی آواز کانوں کی عمر نہیں پہچانتی تھی۔ پھر سحری کا وقت ختم کرنے کی اطلاع کے لئے توپ چلتی، پہلے ایک، اور پھر کچھ وقفے کے بعد دوسری۔ اسی طرح افطار کے وقت کی اطلاع دو بار توپ چلنے کی آواز سے ہوتی۔ اب جو یاد آتا ہے وہ یہ کہ ہم سب کے ساتھ سحری بھی کھاتے، افطار بھی کرتے، اور لُطف اُٹھاتے۔ بڑے فخر سے کہتے کہ ہمارا روزہ ہے۔ اس پر ہمارے چچا، ماموں، ممانیاں پوچھتے کہ روزہ کہاں رکھا ہے، تو ہماری اماں کہتیں کہ ''کہہ دو بیٹا وہ اوپر طاق پر رکھا ہے''۔ افطار کے وقت پہلے مولانا کا حصّہ مسجد جاتا، پھر محلّے کے گھروں میں حصّہ باٹا جاتا، اور پھر گھر میں افطار ہوتا۔ رات کا کھانا تو تقریباً سارا سال مسجد ضرور جاتا کیونکہ وہاں مسافر اور طالب علم رات کو ٹھہرا کرتے تھے۔

رمضان کی آخری تاریخوں سے خالائیں، ممانیاں، چچیاں، سب ہی والدہ سے رائے مشورہ کرنے آجاتیں۔ یہ مشورے ہوتے کپڑوں کے سلسلے میں۔ گو یہ بات ہے ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ کی، لیکن فیشن تو پردے کے اندر، اور ڈولیوں میں بھی رہتا تھا۔

عید کے چار دن پہلے چوڑی والیاں گھروں کی گشت شروع کر دیتیں۔ مالنیں مہندی اور ہار لا کر دکھاتیں۔ حالانکہ مہندی پسی ہوئی بھی ملتی تھی، لیکن پسند یہ ہوتا تھا کہ مہندی سامنے تازہ پسے، اور سردی کے موسم

میں لونگیں ملا کر پیستے کہ اس طرح رنگ بہتر نکلتا تھا۔ اگر رنگ مزید گہرا کرنا ہو تو اجوائن ملا کر پیستے تھے۔ ان سب سوداگروں سے خاندان در خاندان خریداری کی جان پہچان ہوتی تھی، اور وقت سے پہلے ہی یہ لوگ سب گھر پر سامان لے آتے تھے۔ اس طرح ہمیں خریداری کے لئے نہ ٹیلیفون کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ ہی اشیاء کی قیمت ادا کرنے کے لئے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے رہنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

عید کی صبح کا انتظار ہم بہت بے چینی سے کرتے تھے، حتیٰ کہ رات کو سونا مشکل ہوتا تھا کہ صبح عید کی تیاری میں دیر نہ ہو جائے۔ رات بھر جاگ کر کپڑے سینا، دوپٹے میں گوٹا لگانا، شلوکے اور صدریاں، رضائیاں، اور دلائیاں بھی ساتھ ہی تیار ہوتیں تھیں کہ جب مہمان آئیں تو ہر چیز صاف ستھری اور نفیس ہو۔ پھر سوتے وقت اپنے کپڑے اور جوتے وغیرہ بستر کے سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں میں مہندی عید کی چاند رات کو لگتی اور عید کی صبح تک رہتی تھی۔ سردیوں میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ سیکتے کہ مہندی کا رنگ اچھا ہو۔ گرمیوں میں مہندی لگانا اور بات تھی۔ چھت کے بیچا بیچ ایک چار فٹ لمبا اور ڈھائی فٹ چوڑا، جھالروں سے منڈھا پنکھا لٹکا ہوتا تھا۔ اسے ایک ڈوری سے کھینچ کر ہلائیں تو پورے کمرے میں ہوا آتی تھی۔ عید کی وجہ سے ملازمہ دوسرے کاموں میں مصروف، اور ہمارے ہاتھ پیروں میں مہندی، تو پنکھا کون ہلائے۔ لیکن مہندی زیادہ ضروری تھی سو گرمی برداشت تھی۔

عیدین کے بعد محرّم بہت جوش وخروش اور اہتمام سے منایا جاتا تھا، اور بقرعید کے بعد سے ہی محرّم کی تیاری شروع ہو جاتی۔ جس کو شادی بیاہ کرنا ہوتا، وہ اس سے بھی جلد از جلد فارغ ہو جاتا۔ برتن قلعئ ہوتے، گھر میں سفیدی ہوتی، فرش، چاندنیاں، دریاں، دوبرے، اور حقّے صاف کرا لئے جاتے۔ نوحہ اور سوزخوانی کی یادکاری ہوتی۔ رامپور، آگرہ اور امروہہ وغیرہ میں مستورات خود ہی سوزخوانی کرتی تھیں۔ بعض مرد حضرات اس کی باقاعدہ تربیت حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح تحت اللفظ میں مرثیہ پڑھنا بھی ایک قابلیت تھی۔ اس کے علاوہ بڑی انجمنیں لاہور اور لکھنؤ سے آتی تھیں۔ مردوں کی رامپوری انجمن کے بانی ایک صاحب زاہد حسین تھے، جو صاحبِ بیاض بھی تھے۔ ہم اپنے گھر کے دالان میں بیٹھ کر مجلسیں سنتے تھے یا جب انجمنیں ہمارے گھر آتیں تو ہم اپنے دالان میں بیٹھ کر ان کے پڑھے ہوئے نوحوں کو تیزی تیزی میں لکھ لیتے تھے۔ پھر دوسرے دن خواتین کی مجلسوں میں انہی نوحوں کو پورے سرُ کے ساتھ پڑھتے تو لوگ داد دیتے اور

حیران ہو کر کہتے کہ، ''ارے یہ تو فلاں انجمن کا نوحہ ہے''۔ اپنے بچپنے میں ہم یہ سُن کر بہت خوش ہوتے تھے۔

۲۹/ذی الحجہ کو نہایت خوبصورتی سے بنی ہوئی ضریحیں اور تعزیئے ایک جلوس میں شاہی شان و شوکت کے ساتھ لائی جاتیں تھیں۔ اِس کے انتظامات ہمارے والد، ہمارے بہنوئی سید اعجاز حسین ضامنؔ، اور ایک صاحب ولایت علی بیگ کی زیرِ نگرانی ہوتے تھے۔ جلوس میں سب سے آگے ایک تخت نما روشن چوکی ہوتی تھی۔ اُس کے پیچھے بہار یعنی سجاوٹ، پھر گھوڑ سواروں کے دستے نواب صاحب کے ساتھ ساتھ، اور پھر پیدل لوگ مکمل محرّمی بینڈ کے ساتھ چلتے تھے۔ بینڈ پر ماتمی دھن بجتی تھی، خاص طور پر اس مصرع پر......

''یوں فاطمہ کرتی تھیں بیاں، ہائے حسینا، مظلوم حسینا......''

اِس بینڈ کے پیچھے ضریحیں ہوتیں جن کے ساتھ ماتمی دستے ہوتے تھے۔ راستے میں شربتوں کی سبیلیں سیاہ اور سرخ پھولوں سے سجی ہوتیں، اور چھتوں پر برقع پوش خواتین جمع ہو کر جلوس کی زیارت کرتی تھیں۔ شام چار بجے یہ جلوس شروع ہوتا اور مغرب سے پہلے یہ قلعے کی حامد منزل کے اندر امام بارگاہ میں داخل ہو جاتے۔ اس وقت تک روشنی کے لئے گیس کے ہنڈے جلائے جاتے تھے۔ اندر نواب رضا علی خاں اور ان کا عملہ، اور ان سے الگ خواتین کے حصّہ میں تمام بیگمات الگ الگ جلوس کی شکل میں کچھ ضریحیں اندرونی امام بارگاہ میں اور کچھ ایک کمرۂ شہہ نشین میں رکھ دیتے تھے۔ اس دوران ایک صاحبہ ببّن جان اور ان کی ساتھی تاشوں پر نفیری بجاتی چلتیں۔ نواب رامپور پورے بارہ دن عزا خانہ کھلا رکھتے تھے، اور منجھو صاحب سے سوزخوانی کرواتے تھے جن کی آواز اونچی اور پاٹ دار تھی۔ دس اور بارہ محرم کو ہمارے والد اور منجھو صاحب ساتھ مل کر پڑھتے تھے، اور پھر یہ دونوں عشرۃ الثانی پڑھنے امروہہ، حیدرآباد دکّن، سرسی، اور بریلی چلے جاتے تھے۔ نواب صاحب کے یہاں سوزخوانی معظم دلہن بیگم نواب حامد علی خان کرتی تھیں، اور گیتو خانم تحت اللفظ مرثیہ پڑھتی تھیں۔

۷/محرم کو اہلِ سنّت خاندان اپنے گھروں میں کاغذ کے تعزیئے رکھتے تھے۔ اسی دن سنّی اور شیعہ دونوں ہی فرقوں کے خاندانوں میں بچوں کو سبز کپڑے پہنا کر امامؑ کا فقیر بنایا جاتا تھا۔ گلے میں جھولیوں کے ساتھ یہ بچّے ہر گھر میں جاتے، اور امام حسینؑ کے نام پر نیاز کے لئے جھولی میں پیسے جمع کر کے لاتے تھے۔ ان پیسوں سے ۱۲/محرم کو منّت کی نذرِ امام کرتے تھے۔ اس دن ۲۹/ذی الحجہ ہی کی طرح کا جلوس ہوتا، لیکن سبز

کپڑوں میں۔ ہر ایک پیدل آدمی کے سر پر حلوہ اور ملیدہ کا خوان سبز کپڑوں سے بندھا ہوا ہوتا تھا۔اس زمانے میں نہ صرف سنّی بلکہ ہندو تک جلوسوں اور مجلسوں میں شامل ہوتے اور سبیلیں لگاتے تھے۔ ۸/محرم کو بچوں کو حضرت عباسؑ کا سقّہ بنایا جاتا، پانی کی مشک کے ساتھ۔

۹/محرم کو رات بھر مجلسیں ہوتیں، اور سب گھروں میں روشنی رہتی۔ چھوٹے چھوٹے جلوس ان گھروں میں جاتے اور ماتم کرتے۔اسی طرح مختلف انجمنیں بھی مختلف گھروں میں جا کر ماتم کرتی تھیں۔خود نواب رامپور اُس رات کو چالیس گھروں کے اندر امام باڑوں میں شمع کی روشنی کرنے کے لئے ننگے پاؤں جاتے تھے۔ اِس کے لئے اُنہیں ایک خواب میں بشارت ہوئی تھی۔ان میں سے ایک امام باڑہ ڈاکٹر امتیاز حسن نقوی کا تھا جو بعد میں ہمارے سسر بنے۔ ہماری مستقبل کی ہونے والی ساس کنیز فاطمہ نے ایک خواب میں دیکھا تھا کہ وہ نواب کو بیڑی پہنا رہی ہیں۔ اِس لئے نواب صاحب اس امام باڑے میں رات کے تقریباً ۱۲/بجے بمعہ اپنے عملے کے اِن سے اپنے پیر میں بیڑی پہننے آتے تھے۔نواب صاحب ہر امام باڑے میں پانچ سے دس روپے چراغی کے لئے رکھتے جاتے اور فجر کی نماز سے پہلے ہی قلعے میں واپس چلے جاتے تھے۔

دس محرم کی صبح نماز کے بعد توپ چلتی تو پتہ چل جاتا کہ اب ضریح اٹھنے کا وقت ہے۔ بینڈ پر ایک دردناک دھن بجائی جاتی۔ایک منجھو صاحب اور ہمارے والد الوداع پڑھتے اور نوحہ خواں ہوتے ......

اے مومنو ! اٹھاؤ جنازہ حسینؑ کا
دو فاطمہ کی روح کو پرسہ حسینؑ کا

...... اور یا منجھو صاحب کی یہ الوداع جو ہم نے پھر کسی سے نہ سنی اور یہ ہمارے شوہر ذاکر صاحب کے خاندان کی پاکستان اور پھر امریکہ میں مستند الوداع بن گئی ......

الوداع اے اہلِ ماتم، الوداع

۱۰/محرم، روزِ عاشورہ اہلِ سنّت حضرات بھی تعزیئے دفنانے جاتے تھے۔شیعوں کے بڑے جلوسوں کے لئے ویسے تو شیعہ بھی، لیکن خاص طور پر سنّی حضرات شربت کی سبیلیں لگاتے تھے۔ کچھ سنّی لوگ جلوس کے ساتھ کھانے کے دیگیں کر دیتے تھے۔ یہ شام کو شیعہ حضرات کی فاقہ شکنی کے لئے ہوتی تھیں۔

نواب رامپور کے دو بھائی اپنی مجلسیں الگ کرتے تھے۔ایک بھائی جعفرعلی خاں آثر اپنی دو بیگمات کے گھروں میں الگ الگ پورے سوا دو مہینے عزاداری کرتے تھے۔ان کی بیگمات میں ایک تھیں جھانسٹ کی سیدانی اقبال بانو، اور دوسری بیگم تھیں گوہر جان۔نواب کے دوسرے بھائی دلّن صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ان کی بیگم عنبری، جوشکیل رامپوری کی بہن تھیں، شبِ بیداری کے لئے افریقہ سے انجمنیں بلواتی تھیں۔یہ عورتیں اپنی سیاہ ساڑھی، سیاہ بلاؤزاوراسی طرح کی رنگت کی وجہ سے بہت نمایاں رہتیں، ساری رات ہاتھ کا ماتم کرتیں، اورصبح آخری الوداع ہماری بہن کی انجمن کے ساتھ کرتیں۔ان کی عزاداری کی نوحہ خوانی میں ہماری بڑی ہمشیرہ اورزاہد حسین کی بیگم میں مقابلہ رہتا۔ہم اپنی بہن کی آواز میں آواز ملاکران بیگم صاحبہ سے ٹکراؤکواور''طاقتور'' بناتے، جتنا بھی ۹؍یا۱۰؍سال کی عمر میں ہوسکتا تھا۔ہرمہمان کوآنے جانے کا کرایہ دیا جاتا جس کی ادائیگی باہر پھاٹک پردلّن صاحب کے کمیدان کرتے تھے۔

۱۲؍محرم کی شام ۴؍بجے مہندی اُٹھائی جاتی جس کا اختتام کربلائے آغاپور میں مغرب سے پہلے ہوتا تھا۔اس جلوس میں بھی نواب گھوڑے پر ہوتے۔کچھ تعزیے عوام کی کچّی کربلا میں، اور کچھ نواب کی پکّی کربلا میں دفن کئے جاتے تھے۔کچھ ضریحیں لوگ مانگ کرلے جاتے۔وہاں مہندی کودفنایا جاتا اورپھر پلیٹ بھربھرکرتقریباً سیر،سواسیرگوٹا باٹا جاتا۔ایک سیرتقریباًایک کلوگرام کے برابر ہوتا تھا۔اس وقت وزن کے لئے پیمانے یہ تھے: ایک من میں چالیس سیر،ایک سیر میں سولہ چھٹانک،ایک چھٹانک میں پانچ تولہ،اورایک تولہ میں بارہ ماشہ۔گوٹابوریاں بھربھرکے بنتا تھا اوراسے بنانے کے لئے سونف، باریک کٹا ہوا ناریل، چھوٹی الائچی،اورکتری ہوئی چھالیہ کوملاکربھون لیا جاتا تھا۔لوگ باگ اِس چبینہ کوتمباکوکی طرح چباتے پھرتے تھے۔ اسے بنانے کے لئے ان خواتین سے کام لیا جاتا تھا جوگھر میں رہتے ہوئے کچھ آمدنی کرنا چاہتی تھیں۔اِس اہتمام کاانتظام ہمارے والد کے ذمّہ تھا۔اسی طرح سردیوں میں غریبوں اوریتیموں کے لئے لحاف اورگدّے جسے''توشک'' کہتے تھے،ان ہی خواتین سے سلوائے جاتے تھے،اورمحرم میں بانٹے جاتے تھے۔ان اشیاء کے حصول کے لئےغرباءکومصرفِ خیرکے محکمے میں درخواست پہلے سے دینا ہوتی تھی۔

گوکہ نواب کاامام باڑہ۱۲؍محرم کوبڑھا دیا جاتا تھا،لیکن رامپورکےشہریوں کے لئے چہلم کاانتظام بالکل۱۰؍محرم جیسا ہوتا تھا۔ چہلم کی بڑی مجلس نکٹی جیانی کے تھانے کے پاس،ایک صاحب ولایت علی بیگ کے

گھر ہوتی۔ ان کی بیٹی ہماری چچی ہوتی تھیں۔ ۲۹/سفر سے ۸/ربیع الاوّل کے درمیان ہمارے والد کے گھر میں مردانی مجالس کا عشرہ ہوتا تھا۔ کئی دوسرے شیعہ گھرانے بھی اِسی طرح کے عشرے کرتے تھے۔ ۲۹/ذالحج سے ۷/ربیع الاوّل تک ہمارے گھر روزآنہ زنانی مجلس ہوتی تھی۔ ۷/ربیع الاوّل کی رات کو خواتین کی شبِ بیداری ہوتی تھی، اور پھر ۸/ربیع الاوّل کی شام کو سب امام باڑے بڑھا دیئے جاتے، یعنی ختم کر دیئے جاتے تھے۔

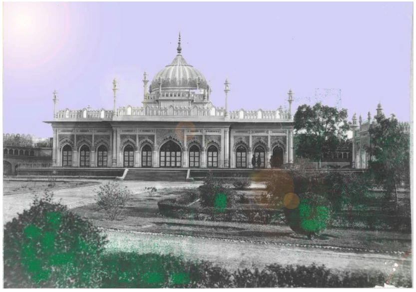

رامپور ۔ قلعہ کے اندر امام بارگاہ

۹/ربیع الاوّل کو حضرت امام مہدیؑ کا یومِ امامت منایا جاتا تھا، اور اس کا اپنا ہی جشن ہوتا۔ میلاد ہوتے، اور محفلیں بھی۔ ۱۲/ربیع الاوّل کو نواب کی طرف سے جامع مسجد میں میلاد النبیؐ کی محفلِ عام ہوتی تھی۔ اس کے بعد بقایا سال میں نواب کے امام باڑے میں ہر جمعرات کی شام کو مجلس ہوتی، جس میں سوزخوانی نواب کی ۱۰/، ۱۲/ اور ۲۰/محرم کی مجلسوں کی طرح، ہمارے والد کرتے تھے۔

رامپور ۔ ۴۰۰/کمروں پر مشتمل خاص باغ پیلس، کبھی اِس کی شان زیادہ تھی۔ سنتے ہیں کہ اب یہ ایک ہوٹل ہے۔

کچھ سالوں کے بعد یہ سب نوابین اور ان کے خاندان قلعہ میں اپنی پرانی محل سراؤں کو چھوڑ کر خاص باغ کی کوٹھیوں میں آ گئے اور عزاداری کے لئے خاص باغ ہی میں الگ امام بارگاہ بنا دی۔ خود نواب

رضا علی خاں خاص باغ پیلس میں آ گئے تھے۔ یاد رہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد ریاست اور یہ قلعہ اور محل سرا ہندوستانی حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ خاص باغ پیلس اور دیگر جائدادیں نواب کے خاندان کے پاس رہیں۔

معاشرتی اور ثقافتی عناصر اور تقریبات

روزمرّہ کی زندگی کے تفصیلی ذِکر کے لئے روزمرّہ کی ضروریاتِ استعمال اوران کی خریداری کے طرایق کے بیان سے بہت مدد ملتی ہے۔ رامپور میں صرف مرد ہی باہر جا کر خریداری کرتے تھے۔ خواتین اپنی ساری ذاتی خریداری گھر پر آنے والے سوداگروں سے کرلیتی تھیں۔ جیسا کہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے، رامپور کے تھوک فروشوں کے بازار کا نام گنج تھا جہاں تھوک پر سامان، جیسے سرسوں کی کھلی، نمک اور مرچ، اور سبزیاں وغیرہ، اور کپڑوں میں اطلس، کمخواب، زربفت، پوتھ ساٹن، جامہ دار، چکن، لٹھا، ململ، حیدرآباددکن کی جالی وغیرہ بکتے تھے۔ گنج بازارایسا ہی تھا جیسے کہ کراچی میں سبزی منڈی ہوتی ہے، یا امریکہ میں فارمرز یا سائڈ واک مارکیٹ ہوتی ہیں۔ اکثر مرد حضرات یہیں سے خریداری کرنا پسند کرتے تھے، اوراب بھی جب ہم امریکہ میں لوگوں کو کاسٹکو (Costco) میں تندہی سے خریداری کرتے دیکھتے ہیں تو گنج یاد آتا ہے۔ اس کے علاوہ ہفتے میں تین دن توپ خانہ دروازہ کے میدان میں پینٹھ لگتی تھی جو کراچی میں منگل بازار یا جمعہ بازار، اور نیویارک کی نئ اشیاء کی فِلی مارکیٹ جیسے بازار ہوتے تھے۔ یہاں سے اچھے معیار کی اشیاء مناسب قیمت پرمل جاتی تھیں۔ گھریلو سامان سے لے کر مرغیاں، بکری، گائے، بیل، پلنگ اور پیڑھیاں، باندھ، نواڑ، ادوائن اور کھڑاؤں تک بھی ملتی تھیں۔ اب یہاں کچھ تعارفات ضروری ہیں: پہلے یہ کہ نواڑ ۲/ یا ۳/انچ چوڑا مضبوط دھاگہ سے بُنا ہوا پٹّہ ہوتا تھا جس کو ایک کسے ہوئے جال کی صورت میں پلنگ کے ڈھانچے سے اس طرح باندھتے تھے جیسے کہ بُنائی کی گئی ہو، اور یہ کوشش ہوتی تھی کہ اچھے سے اچھے خوبصورت نمونے کی بُنائی کی جائے۔ نواڑ سے بنا ہؤا بستر نرم ہوتا تھا۔ پلنگ اگر نواڑ کے بجائے پٹسن سے بُنے ہوئے پتلے رسّے، یعنی باندھ سے بنائیں تو پلنگ کافی سخت ہوتا تھا، اور لیٹتے ہوئے باندھ چبھتا تھا۔ اس کے علاوہ باندھ کو مستقل کستے رہنے کے لئے پلنگ کی پائنتی کی طرف پٹسن کی ادوائن باندھنا ضروری تھی۔ دوسرے یہ کہ کھڑاؤں لکڑی کے چپل ہوتے تھے اور بارشوں کے موسم میں خاص طور پر فائدہ مند ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسجدوں میں وضو

کے لئے جاتے وقت نمازی مسجد میں رکھی ہوئی کھڑاؤں ہی استعمال کرتے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں جب ہم یورپ گئے تو ہم نے جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں جرمن لوگوں کو بھی کھڑاؤں جیسے بند جوتے اور کُھلے چپل استعمال کرتے دیکھا۔ اسی طرح ڈنمارک اور سوئٹزرلینڈ میں بھی کھڑاؤں جیسے لکڑی کے چپل استعمال ہوتے ہیں۔

خواتین کو خریداری کے لئے باہر نہیں جانا پڑتا تھا، کیونکہ ان کی ضروریات کی تمام چیزیں بیچنے والے گھر کے باہر سے آوازیں دیتے ہوئے گزرتے تھے۔ کبھی مرغی کے چوزے بیچنے والے گزرتے تو ہم مچل جاتے کہ ہمیں چوزے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ اب سوداگر کو آواز دیں تو کہیں ''اے مرغی والے اِدھر آؤ''۔ بڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ کسی کو ''مرغی والے'' کہنا رامپور میں گالی تھا، ایسے ہی جیسے پنجابی میں پنگے لینا۔ ہمارے گھر کے سامنے کے دروازے پر ایک ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی دراصل گھر کے سامنے ایک کشادہ برآمدہ کو کہتے تھے۔ اس سے یہ سہولت ہوتی تھی کہ گرمی اور بارش میں بھی سوداسُلف بیچنے والے اِس ڈیوڑھی کے سائے میں بیٹھ کر سکون سے سامان نکالتے، اور کسی بچے یا مرد کے ہاتھ اندر زنانے میں خواتین کی پسند کے لئے بھیج دیتے تھے۔ عید کی سلائیوں کے لیے گھر کے اندر کپڑوں کے تھان کے تھان آتے۔ مستورات اپنی پسند اور مقدار بچّوں سے کہلواتیں اور اس طرح یہ سودا ہوتا۔ اتنی دیر میں کپڑے والے کی شربت یا پانی سے تواضع بھی ہوتی، اور حساب کتاب کے بعد سوداگر سلام دعا کے بعد رخصت ہوتا۔ یہ بھی خیال رہتا تھا کہ سوداگر بعد میں شکایت نہ کریں کہ ''مرزا صاحب کے ہاں کسی نے پانی کو بھی نہ پوچھا''۔ اب شاپنگ مال اور گروسری اسٹور میں شاپنگ کرتے ہوئے رامپور خواب کی طرح یاد آتا ہے۔

اکثر لوگ وضع داری نباہتے تھے اور سفید پوشی کا بھرم اور لحاظ رکھتے تھے۔ خریداری میں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے تھے۔ زیورات اور ملبوسات تو سب گھر کے اندر ہی رہتے ہوئے سب کوشش کرتے کہ اچھا پہنیں، کچھ شوق میں اور زیادہ تر پیسے محفوظ کرنے کے لئے پہنتے تھے۔ ان زیورات کے ناموں کی ایک فہرست کچھ ایسی ہوتی تھی:

☆ سر کے لئے سراسری، ٹیکہ، جھومر؛

☆ کانوں کے لئے مگر چودانی، کرن پھول، جُھمکے، بُندے، ٹاپس، بالیاں، پتّے، بجلیاں، اور انتیاں ؛

☆ ناک کے لئے گول نتھ، نتھ، لونگ، ناک کی کیل، اور بڑے چھلّے جیسا بُلاق جو ناک کی درمیانی دیوار کو چھید کر پہنتے تھے ؛

☆ گلے کے لئے طوق، گلو بند، چمپا کلی، ڈھولنا، جگنو، ہار، پنچ لڑا، ست لڑا، نولکھا ہار، اور ہنسلی ؛

☆ بازو کے لئے جوشن نو نگے ؛

☆ کلائی کے لئے گہنے، کڑے، کنگن، چوڑیاں، پٹیریاں، پری چھن، اور دست بند ؛

☆ ہاتھ کے انگوٹھے میں آرسی، ہاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھیاں اور چھلّے ؛

☆ ٹخنے کے لئے سادی پازیب، پازیب ہزارے کی یعنی ہزار دانے کے گھنگرو کے ساتھ صرف ایک پیر میں، جھانجھن، چھڑے، لچھے، بچھوے، توڑے، جیری؛ اور

☆ پیر کے انگوٹھے میں چھلّے، پیر کی انگلیوں میں چٹکی ؛

رامپور چھوڑنے کے تقریباً نصف صدی بعد ہم نے امریکہ میں دیکھا کہ اِن رسومات اور زیورات کی نقل کرتے کرتے، امریکیوں اور انگریزوں نے اِن سب زیورات کے علاوہ پیٹ تک میں کانوں کی طرح سوراخ کر کے کڑا ٹانگنا شروع کر دیا ہے، اور سب سے مختلف یہ کہ کچھ لوگ تو زبان میں نتھ کی طرح کا زیور تک ٹانگ لیتے ہیں۔

ہماری شادی کے وقت جہیز میں تقریباً ہر طرح کے زیور کا ایک عدد، اور کچھ کے دو یا تین عدد مختلف انداز کے دیئے گئے تھے۔ چاندی اس وقت ۸/آنے تولہ تھی اور سونا ۲۷/روپے تولہ تھا۔ اُس وقت کے حساب سے یہ بہت مہنگا تھا۔ گھر کے ملازم ۲/روپے مہینہ اور کبھی ایک روپیہ مہینہ پر ۲۴/گھنٹے روزآنہ، اور ہفتہ کے ساتوں دن کی نوکری کر لیتے تھے۔ ہماری امّاں ہمیں بتاتی تھیں کہ ان کی شادی کے وقت سونا ۲۷/روپے تولہ تھا۔ بنک وغیرہ تو تھے نہیں، لوگ اور خاص طور پر خواتین اپنی جمع پونجی سونے کی شکل میں محفوظ کرتے تھے۔ ہماری امّاں نے خود اتنا سونا زیورات اور سونے کے پتّوں کی شکل میں جمع کر کے رکھا تھا کہ جب سونا ۲۷/روپے تولہ ہوا تو انہوں نے مکان خریدنے کے لئے ایک چھوٹے سے ٹوکرے بھر سونا بیچا۔ اسی طرح جب شادی کے کئی سالوں بعد ہم ان کے پاس گئے تو انہوں نے سونے کا ایک ہلکا والا پات بیچ کر ہمیں واپسی کا کرایہ دیا۔ واپسی کا کرایہ دینا ایک رسم تھی جو امّاں ہمیشہ پوری کرتی رہیں۔

اب روز مرّہ کے استعمال میں زیورات تو کم استعمال ہوتے تھے، اور پھولوں اور پھول کے ہاروں کا استعمال زیادہ تھا۔ پھولوں میں گلاب، چنبیلی، موگرا، بیلا، اور مدرمان زیادہ مقبول تھے۔ گرمی شروع ہوتے ہی روز آنہ شام کو قریبی باغوں سے لاکر مالنیں گھر گھر پھول اور پھولوں کے ہار اور کنگن بیچتی تھیں جنہیں شادی شدہ خواتین پہن لیتی تھیں۔ ہم لڑکیوں کو ہار پہننا منع تھا، اور ہمیں شادی سے پہلے یہ پھول صرف سونگھنے کے لئے ملتے تھے۔ رات کو یہ ہار مٹی کے بنے ہوئے پانی کے گھڑے اور صراحی کے منہ پر بندھے سفید ململ کے کپڑے کے گرد باندھ دیتے تھے تاکہ یہ گھڑے کی ٹھنڈک سے تازہ رہیں اور صبح کو پھر پہنے جاسکیں۔ اس کے علاوہ پھولوں کو تازہ رکھنے کے لئے انہیں لٹکن میں کورے گھڑے پر ٹانگتے تھے۔ صبح کو اٹھ کر ان پھولوں کو کان میں پرولیں تو ان کی خوشبو سے سارا دن مگن رہتے۔ سنگھار بناؤ کی مزید ترکیبیں ریڈیو پر نشر ہوتی تھیں جو اکثر صبح کے وقت سب ناشتہ کے دوران سنتے تھے۔ ان میں بال لمبا کرنے کی ترکیبیں اور نئے نئے سلائی بنائی کے طریقے، یعنی فیشن، بتائے جاتے، جو زیادہ تر دہلی سے شروع ہوتے تھے۔ سرمہ، مسّی، کنگھی، رومال، کریم، پاؤڈر، طرح طرح کے عطر تھے، جس میں ہماری پسند کا خس کا عطر تھا۔ یہ عطر ایک خاص گھاس کی جڑوں سے نکلتا ہے، اور اس کے عرق کو خوشبو کے لئے کئی طرح کے شربتوں میں بھی ڈالتے تھے۔ ہمارے گھر میں اسی گھاس کی چٹائیاں کھڑکیوں پر ڈالتے تھے جنہیں خس کی چٹیاں یا ٹٹیاں بھی کہتے تھے۔ گرمیوں میں جب ان پر پانی ڈالیں تو خس کی خوشبو سے پورا گھر مہک اٹھتا تھا۔

ہر طرح کا کپڑا بھی ہم گھر پر آکر آواز لگا کر بیچنے والے پھیری والوں سے خریدتے تھے۔ ویسے قیمتی سامان کی خریداری بازار نصراللہ خاں کے بزازوں ہی سے ہوتی اور یہ خریداری ہمارے ابّا کرتے تھے۔ کپڑوں میں بھی اتنے ہی مختلف طرح کے انداز ہوتے تھے۔ عورتوں کے لباس میں کامدانی اور بنارسی ساڑھیاں، بلاؤز، گوٹ والا یا پوری پلیٹوں والا غرارہ، شرارہ، آڑا پاجامہ اور چنّٹوں والا یا گوٹ والا دوپٹّہ وغیرہ ہوتے تھے۔ قمیض اور شلوار تو رامپور میں کافی دیر میں متعارف ہوئیں۔ اکثر عورتیں خود کاڑھتی اور سیتی پروتی تھیں۔ صرف صاحبِ حیثیت بیگمات کے گھروں میں یہ کام ان کی مغلانیاں کرتی تھیں۔ کپڑوں میں گوٹا لچکا تو ہر ایک لگاتا، لیکن سچا گوٹا لچکا صرف صاحبِ حیثیت بیگمات ہی لگواتی تھیں۔ پیسہ بینکوں میں نہیں رکھتے تھے، بس ان ہی زیورات، گوٹے لچکے اور دوسری اشیاء میں پیسہ لگاتے، اور کبھی وقت پڑا تو یہ چیزیں کام آگئیں، جیسے کہ بینک سے پیسے نکال لئے۔ اسی طرح ہمارے پاس جو سچے گوٹے اور لچکے کے کپڑے تھے ان

میں سے سچّے بروکیڈ کی ایک ساڑی تھی جو ہمارے شوہر نے ہمیں لا کر دی تھی۔ یہ ساڑی پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ہمارے لئے کافی کار آمد رہی تھی۔

مردوں کے لباس میں اچکن اور شیروانی، انگرکھا، دوپلّی ٹوپی، چھ گز کا صافہ، گرمیوں میں ململ کا کڑھا ہوا یا سادہ کُرتا، قمیض، اور علی گڑھ کٹ پاجامہ ہوتا تھا۔ سردیوں میں مرد ایک چادر اوڑھ لیتے تھے، جس طرح سندھ اور پنجاب میں پہنی جاتی ہے۔ خاص خاص موقعوں پر مردوں کا لباس کچھ اس طرح کا ہوتا تھا: سفید چغہ، اس سے ملتی ہوئی شیروانی، اندر کرتا، کمر میں ایک چوڑا سا بند جس میں ایک سنہرا پیتل کا بکل ہوتا تھا۔ اس بند کو چوڑی بیلٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لباس کے ساتھ اکثر مرد سیاہ گرگابی پہنتے تھے جو کہ موکیشن جوتے کی طرح ہوتا تھا۔ یہ جوتا کرم یا وارنش قسم کے چمڑے سے بنا ہوتا تھا۔ ہمارے سسر جب نواب کے ساتھ فری میسن لاج جاتے تو اسی طرح کا لباس پہنتے تھے۔ جانے سے پہلے ان کا اردلی بلاس سے کمر کے سنہرے بند کے بکل کو اس طرح چمکاتا تھا جیسے کہ فوجی افسران کی وردی پر کندھے کے پٹے کے ستارے اور بٹن چمکتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے سسر کو فری میسن جانا ناگوار تھا اور یہ صرف نواب کی وجہ سے وہاں جاتے تھے، لیکن انہوں نے کافی بار پوچھنے پر بھی یہ نہیں بتایا کہ وہاں کیا ہوتا تھا۔ فری میسن لاج کی یہ رازداریاں ابھی بھی قائم ہیں۔

بڑی عمر کے لوگوں کی محفلوں میں پان، حقّہ، اور سگریٹ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ پانوں میں سانچی پان مقبول تھے۔ سانچی بھوپال کے پاس ایک زراعتی علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ بنگلہ پان بھی اچھے کہلاتے تھے۔ پاندان بھی ہر گھر کی زینت ہوتا تھا اور ہر لڑکی کی شادی کے وقت اس کے جہیز میں ضرور ہوتا تھا۔ لکھنؤ کے پاندان گول ہوتے تھے، دہلی کے ہشت پہلو، اور حیدر آباد دکن اور رامپور کے پاندان چاندی یا تانبے کے بنے ہوتے تھے اور ان پر قلعئی کر کے انہیں خوب چمکا کر رکھا جاتا تھا۔ حقّوں میں پیچوان، لکھنوی، اور رامپوری حقّے استعمال میں آتے تھے۔ پھر دیہاتی حقّے جو دیہاتی ہاتھ میں اٹھائے ہوئے گڑگڑاتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ کچھ دیہاتی تو صرف چلم میں نیچے تمباکو بھرتے اور اوپر انگارے، اور پھر چلم کے نیچے سے کش لگاتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ سگریٹ میں پاسنگ شو اور کنگ اسٹارک زیادہ مشہور تھے۔

بچپن میں گڈے، گڑیوں کی شادیاں اور دوسری تقریبات تو ہوتے ہی تھے۔ اس کے علاوہ جو خاص چیزیں تھیں ان میں تھیں اصلی شادیاں، بیت بازی، اور کبھی فلمیں یا گانے، مگر یہ سب بہت سوچ بچار کے

بعد کرنا ہوتا تھا۔ گھر تو لبِ سڑک تھا ہی، اور پھر سامنے تھانہ تھا، لہٰذا کسی بھی تقریب سے پہلے ہر طرح سے اہتمام ہوتا کہ آواز باہر نہ جائے۔ ہر خوشی پر صرف پیشہ ور گلوکارہ ہی گاتی تھیں اور انہیں وہاں میراثن کہا جاتا تھا۔ خوب شاعرانہ کلام ہوتے تھے جیسے کہ ......

؎ تصویر شمع ہوں میں سوزِ پنہاں سے

اور یا......

دیوانے دل ٹھیر جا چلتا ہوں سوئے صحرا
مل مل کے رو تو لوں میں ہر گوشہء مکاں سے

کہا جاتا تھا کہ یہ شعر بہادر شاہ ظفر اپنی گرفتاری کے بعد گنگناتے ہوئے گئے تھے۔

اکثر ہماری ساری زاد بہنیں دالانی کھڑکیوں سے ہوتی ہوئی یا ڈولیوں پر سوار ہو کر آجاتیں اور بیت بازی کا پروگرام بن جاتا۔ ہم تمام چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور، خالہ زاد بہنوں کو ملا کر زاد بہنیں کہتے ہیں، جیسے کہ انگریزی میں کزن ہوتا ہے۔ بیت بازی کی ابتداء اماں اس طرح کرتیں، جس کے بعد اشعار اور جوابی اشعار کا سلسلہ ہو جاتا تھا......

میم منم، میم منم، زلفہ زنجیر منم
خانہ الف بے، ب دو ہزار، لام میم اور تین ہزار تے

اس شعر کے پیچھے خبر نہیں کیا کہانی تھی۔ بس پھر سب ایک سے بڑھ کر ایک سخت شعر کہتا اور مقابلہ رات گئے چلتا۔ گرمیوں کے موسم میں گنّا کھاتے ہوئے شاعری چلتی، اور سردیوں میں مونگ پھلیاں، گُڑ اور گنڈ ورے چلتے۔

اسی طرح ایک اور محفل بنام چہار بیت ہوتی تھی جس میں مختلف شرکاء صوفیوں کا کلام طنبل بجا کر سناتے تھے۔ یہ چہار بیت ہمارے گھر کے سامنے کے تھانے میں ہوتی تھی اور اس کی آواز ہمارے گھر میں بھی آتی تھی۔ طنبل ایک گول تھالی سی ہوتی ہے جس پر کھال منڈھی ہوئی ہوتی، اور اس کے اطراف میں کپڑا منڈھا ہوتا تھا جو ڈوریوں سے کسا جاتا تھا، اور کبھی کبھی کناروں پر گھنگرو بھی لٹکے ہوتے تھے۔ اسے ایک ہاتھ میں پکڑ کر

دوسرا ہاتھ مار مار کر بجاتے تھے۔ ہمارے گھر کے برابر ایک صاحب بنام حافظ جی اپنی والدہ، بیگم اور سات بیٹیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ صاحب نواب کے توپ خانے میں توپچی تھے۔ اُن کی بڑی لڑکی عزیز طنبل اچھا بجاتی تھیں اور چہار بیت بہت اچھا سناتی تھیں۔ ان ہی سے ہم نے بھی چہار بیت سیکھی تھی۔ حافظ جی کی دوسری لڑکی انیس تو ہماری قریبی دوست تھیں۔

جب تک تھوڑے سے بڑے ہوئے تو فلمیں بھی آنے لگی تھیں، لیکن ہمیں دیکھنے کی اجازت ملنا تو تقریباً ناممکن رہتا تھا۔ البتہ جب ۱۹۳۵ء میں بڑی بہن کی شادی ہوگئی تو ان کو تو آزادی مل گئی اور وہ فلمیں دیکھنے لگیں۔ کبھی کبھی وہ ہم کو بلا لیتیں، اور ہمیں ہمارے والد ہماری بہن کے گھر صبح کو چھوڑ آتے۔ پھر ہماری بڑی بہن ہمیں چھپا کر، یعنی والدین کی لاعلمی میں، میٹنی شو کی فلمیں دکھانے لے جاتیں۔ اس طرح ہم نے پرانی مغلِ اعظم، عدلِ اکبری، اور پکار جیسی فلمیں دیکھیں تھیں۔ صدی کی چوتھی دہائی، تقریباً ۱۹۴۰ء میں تو رامپور میں بھی فلموں کے اشتہار عام ہو گئے تھے اور اخباروں میں بھی اشتہار آنے لگے تھے۔ لیکن ہمارے والدین ہمیں فلمی صفحہ پڑھنے نہیں دیتے تھے۔ دوپہر کو تانگہ پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر اشتہاری آتے اور اعلانیہ انداز میں کہتے کہ ''آ گیا، آ گیا، دل دہلانے والا شاہکارا''۔ تقریباً ہر فلم ہی "دل دہلانے والا شاہکارا" ہوتی تھی۔ تانگہ پر تصویروں کے تختے ہوتے تھے۔ کبھی تصویروں کے یہ تختے اتنے بڑے ہوتے تھے کہ ان میں اپنے پہیئے بھی لگے ہوتے تھے اور مزدور انہیں ہاتھوں سے دھکیلتے ہوئے تانگے کے ساتھ چلتے تھے۔ اگر فلم اور بھی اچھی ہو تو ساتھ بینڈ بھی ہوتا جو فلم کی دھنوں کو بجاتا ہوا گزرتا تھا۔

نواب رامپور کی اپنی ایک تھیٹر کی کمپنی تھی جو قلعہ کے اندر سے کام کرتی تھی۔ اس کمپنی کے اپنے ملازمین تھے۔ ہمارے دولہا بھائی کے لکھے ہوئے دو ڈرامے ''سفید خون'' اور ''خوبصورت بلا'' وہاں بڑے مشہور ہوئے تھے۔ جب نواب کا اسٹیج ڈراموں سے دل بھر گیا تو انہوں نے یہ تھیٹر کمپنی بند کر دی کہ نوابی اور شہنشاہی میں کام ایسے ہی ہوتے تھے۔ سال میں دو مرتبہ محفلِ عام ہوتی تھی جس میں نواب کے بڑے عہدیداروں کے خاندان شریک ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۷ نومبر کو نواب رضا علی خاں اور دسمبر میں رفعت زمانی بیگم کی سالگرہ منائی جاتی تھیں۔ ان سالگرہوں میں قلعہ بقعۂ نور بنا ہوتا اور کونے کونے میں اور ہر درخت پر روشنی کے رنگ برنگے قمقموں سے زبردست روشنی کا انتظام ہوتا تھا۔ آتش بازی ہوتی، اور نواب کو

نذریں دی جاتی تھیں۔ ان نذروں کا طریقہ یہ ہوتا کہ نواب اور بیگم صاحب کے لئے آپ ایک رومال میں اشرفیاں رکھیں، اور پھر ان کے سامنے جھک جھک کے جائیں، رومال ان کی خدمت میں پیش کریں، اور پھر اسی طرح جھک جھک کے سلام کرتے ہوئے، بغیر پیٹھ موڑے، عالمِ رکوع میں باہر واپس آجائیں۔ سنتے تھے کہ تمام نوابین اسی طرح کی زندگی رکھتے تھے کہ اشرفیاں بھی دو اور رکوع میں جھک کر سلام بھی کرو۔

قلعہ کے اندر کی تمام محفلوں کے لئے حفاظتی انتظامات بہت سخت ہوتے تھے۔ زنانہ سواریوں کے لئے بھی ایک انتظام تھا۔ یہ خواتین تانگوں اور یکّے سے آتی تھیں، اور ان سواریوں پر پردے بندھے ہوتے تھے۔ سواریاں زنانی ڈیوڑھی پر رُکتی تھیں۔ یہاں کمیدان، جو ایک طرح کے حفاظتی کمانڈر ہوتے تھے، آنے والوں کے نام اور پتہ کی جانچ کرتے، اور پھر سواری اندر جاتی۔ اندر اِن خاتون مہمانوں کے لئے داروغہ، چوب دار، اور کہاریاں تیار ہوتی تھیں، اور ہر مہمان کے سامان کی تلاشی کے لئے ان کی بقچیاں کھولی جاتی تھیں، اور پھر ان کو مہمان خانے چھوڑنے خواجہ سرا جاتے تھے۔ بقچی دراصل ایک طرح کا پیکیج ہوتا ہے۔ ایک ۴ رفٹ لمبا، ۴ رفٹ چوڑا کپڑا جس میں چیزیں رکھ کے کپڑے کے چاروں کونوں کو پکڑا، اور پھر گرہیں لگا دیں تو یہ بقچی بن جاتی تھی۔ کھانے سے پہلے مہمان چلمچی میں ہاتھ دھوتے تھے۔ یہ چلمچیاں چاندی یا پیتل کی بنی ہوتی تھیں۔ مہمانوں کو کھانا، اور ساتھ میں پان، چھالیہ، تمباکو، الائچی، اور دوسری چیزیں الگ الگ تھالیوں میں رکھ کے تھالی کو سفید سرپوش کپڑے سے ڈھک دیا جاتا تھا۔ خاص تھالیوں کے سرپوش کو حفاظت سے باندھنے کے لئے اسے سفید برّاق ''کسنے'' سے کس دیتے تھے۔ اکثر بڑا کھانا سب ایک ساتھ کھاتے تھے۔ نواب صاحب کے اپنے ڈاکٹر، انجینئر، شاعر، اور دیگر ملازمین خدمت کے لئے موجود رہتے تھے۔

محفلوں میں سب شرکاء بڑے دیوان خانے میں قالین پر گاؤ تکئے پر ٹیک لگا کر بیٹھتے، اور چاندی کی منال لگے پیچوان سے تمباکو نوشی کرتے تھے۔ پیچوان اُس حقّے کو کہتے تھے جس میں چاندی یا سونے کی چلم ہوتی ہے۔ اس چلم میں کوئلوں کے اوپر تمباکو رکھتے اور چلم کو اوپر سے ڈھک دیتے تھے تاکہ چنگاریاں نہ اڑیں۔ نواب رامپور خود بھی راگ، راگنی سے اچھی طرح واقف تھے، اور غلطی کرنے والے کو ٹوکنے میں تکلّف نہیں کرتے تھے، ''اے بن جان، ذرا سنبھل کے اٹھاؤ''، یا ''ارے بگّن، آواز کو یوں اوپر اٹھاؤ''، وغیرہ وغیرہ۔ مردانے میں احمد جان تِھرکوا طبلہ نواز تھے، اور زنانے میں ایک منّی بیگم طبلچن تھیں۔

ہر سال مارچ میں ایک نمائش اور میلہ ہوتا تھا جس میں مختلف شہروں اور مختلف ملکوں سے آئے ہوئے تاجر اپنی دُکانیں سجاتے تھے، اور سرکس بھی ہوتا تھا۔ اس میں موت کا کنواں اور طرح طرح کے جھولے بھی ہوتے تھے۔ اسی نمائش کے ساتھ ایک دن ایک میوزک کانفرنس ہوتی تھی اور دوسرے دن ایک مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس کانفرنس میں زنانہ پردے کا زبردست اہتمام ہوتا تھا۔ اندر زنان خانے میں نواب کی بیگمات اور اُن کے تمام ڈاکٹروں اور دیگر عہدے داروں کی بیگمات ہوتی تھیں۔ انہی کانفرنسوں میں فیاض علی خاں، سارنگی نواز بندو خان، ستار نواز ولایت علی خاں، ملکہ پکھراج، اور اختری بائی فیض آبادی جیسے فنکار آتے تھے۔ مشاعرہ کی نظامت ہمارے دولہا بھائی اعجاز حسین ضامنؔ کرتے تھے۔ ضامنؔ صاحب کے پاس ریاست کے تین محکمے تھے: اشاعت، اوقاف، اور مصرفِ خیر۔ اس کے علاوہ وہ نواب اور ان کی بیگم کے شاعری کے استاد بھی تھے۔ نواب صاحب رجاؔ پیا اور بیگم صاحبہ عصمتؔ تخلّص کرتی تھیں۔

شادیوں کے مواقع پر نوابین کے مردانے میں مجرے ہوتے تھے۔ ان ہی کی دیکھا دیکھی، دوسرے صاحبینِ استطاعت بھی اپنے بچوں کی شادیوں میں اسی طرح مجرے کرانے لگے، کیونکہ اچھائیاں اور برائیاں اوپر سے نیچے سفر کرتی ہیں۔ زنانے میں میراثنیں گاتیں۔ صبح ہونے سے پہلے بھیرویں گا کر دلہن کی رُخصتی سناتے ہوئے جب مجرے والیاں زنانے حصّے میں آتی تھیں تو ضعیف خواتین اس طرح دوپٹے سے سر ڈھانپتی تھیں جیسے کہ کوئی مرد اندر داخل ہوا ہو۔ ہمارے اپنے گھر میں شادی بیاہ کے موقع پر میراثنیں قصّے کہانیاں اور لطیفے سنایا کرتی تھیں۔ ریڈیو آچکا تھا، اور گراموفون بھی، لیکن ایسی تفریح کے لئے ٹیلی ویژن اور وی سی آر نہیں تھے۔ گانا ناچنا دیکھنا ہو تو اِسی طرح دیکھو، اور اگر کھیلنا ہو تو یہ نہیں کہ دوسرے کا میچ دیکھ لیا۔ اپنا کھیل خود ہی کھیلو۔

اس زمانہ میں رامپور میں کھیل ہندوستانی ہی تھے جن میں کرکٹ اور ہاکی کے علاوہ گلّی ڈنڈا، گیڑی، انٹے، کبوتر بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، آتش بازی، اور تاش سے لوگ وقت گزارتے تھے۔ ماہِ صفر کے آخری ہفتے میں آخری چہار شنبہ منایا جاتا تھا۔ شہر سے دُور ایک کھلے میدان میں ایک بڑا سا خیمہ لگتا تھا۔ ہر ایک ہی وہاں جاتا اور میلے کا سماں ہوتا تھا۔ قوالیاں، گانے اور ہر طرح کے کھیل ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم بھی ایک سہیلی کی والدہ کے ساتھ گئے، اور کھیل کھیل میں کافی دور پودوں میں نکل گئے۔ نہ جانے کس پودے سے

ہاتھ لگا، یا کوئی الرجی کا اثر ہوا کہ آنکھیں بری طرح سوج کر پھول گئیں، اور ڈاکٹر کی دوا سے ایک ہفتے میں صحیح ہوئیں۔

ہر جمعرات کی رات کو مختلف مزاروں پر قوالیاں ہوتی تھیں۔ ہمارے گھر کے قریب ایک حافظ جمال صاحب کے مزار پر ہونے والی قوالی کی آواز رات بھر ہمارے گھر آتی تھی۔ وہ تو یہ کہیں کہ کچھ تو عادت ہو گئی تھی اس شور کی، اور کچھ ہم لوگ دِن میں اتنا تھک جاتے تھے کہ اس شور کے باوجود بھی سو سکتے تھے۔ ہر چیز ہاتھ سے ہوتی تھی اور ہر جگہ جانے کے لئے پیدل، سائیکل، یا تانگہ، یہ ہی صورتیں تھیں۔ لہٰذا تھکن تو لازم تھی۔ ایک دن ہم نے گانوں میں اللہ ہو، اللہ ہو کی آوازیں سنیں تو اماں نے بتایا کہ اسے حلقہ کہتے ہیں۔ ایک شعر ابھی تک یاد آتا ہے......

تجھ میں آئی کہاں سے نزاکت کی بو

اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

شادیوں کی داستانیں، جن اور بھوت پریت

ہم ابھی کھیل کود میں ہی دن گزار رہے تھے کہ ہماری بڑی بہن کا رشتہ سید اعجاز حسین عابدی ضامنؔ کی طرف سے آ گیا۔ یہ خاندان نوگاواں کا تھا، اور بہت معزّز اور مذہبی لوگ تھے۔ ضامنؔ صاحب کے والدین ان کی کم عمری میں انتقال کر گئے تھے۔ ضامنؔ صاحب بمبئی میں فلموں کی کہانیاں لکھتے تھے۔ فلمیں کیونکہ خاموش ہوتی تھیں تو ہم سوچتے تھے کہ ان کی کہانیوں میں 'ڈائیلاگ' نہ ہونے کی وجہ سے کہانی لکھنا آسان ہوگا۔ لیکن بعد میں ضامنؔ صاحب سے معلوم ہوا کہ خاموش فلموں کی کہانی اسٹیج کے ڈراموں سے کہیں زیادہ مشکل تھی کیونکہ آپ بھی اور اداکار بھی الفاظ کا سہارا نہیں لے سکتے تھے، اور پوری کہانی، زمانہ، اور وقت صرف اور صرف سین کی سجاوٹ اور اداکاروں کے تاثرات سے دکھانا ہوتا تھا۔ نواب رامپور جب ۱۹۳۴ء میں بمبئی گئے تو ضامنؔ صاحب سے بمبئی کے تاریخی تاج ہوٹل میں ملاقات ہوئی، اُن کی شاعری سنی، اور نواب کو یہ صاحب

بمبئی ۱۹۳۴ء : تاج ہوٹل

اتنے پسند آئے کہ اپنے ساتھ اُسی دن رامپور لے آئے۔ بہر حال ہمارے گھر میں رواج کے مطابق رِشتہ کا استخارہ نکالا گیا تو وہ حق میں آیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی۔

ہماری بہن کی شادی سے ایک مہینے پہلے اُن کی ہونے والی نند صفدری بیگم کی شادی تھی، اور اسی زمانے ایک بہت اونچے پیمانے کی ہڑتال ہوگئی۔ روز جلوس نکلتے، جلسے ہوتے، اور ہنگامہ ہوتا۔ ہڑتال کا نام بھوکا پارٹی پڑ گیا تھا۔ اُوپر سے انتہائی سخت گرمی کا موسم تھا۔ بارات کو انگوری باغ سے آنا تھا، اور صورتِ حال خراب تھی۔ ضامنؔ صاحب کے عہدے کی وجہ سے بارات کی حفاظت کے لئے ریاستی فوج دستہ کے ساتھ ایک ٹرک کا انتظام ہوا، اور اُسی ٹرک پر رخصتی ہوئی۔ ولیمہ کے دِن تو اتنی کشیدگی رہی کے کسی مہمان کو گزرنے نہیں دیا اور تمام کھانا سڑا اور دفن کرنا پڑا۔ اُس زمانے میں کھانے کو کوڑے میں نہیں پھینکتے تھے، بلکہ دفن کرتے تھے۔

بڑی بہن کی شادی تک صورتِ حال بہتر ہوگئی تھی۔ یہ شبِ براٗت کی رات تھی، ۱۱/نومبر ۱۹۳۵ء بمطابق ۱۴/شعبان ۱۳۵۴ھ۔ دولہا بھائی کا خاندان بہت مذہبی تھا، لہٰذا موسیقی اور گانا بجانا نہیں ہوا۔ بارات آنے سے پہلے ہی ہم نے اپنے ہم عمر ماموں علمدار حسین اور دوسرے رشتہ دار بچوں کے ساتھ پھلجھڑیوں اور آتش بازی سے شبِ براٗت کا سارا ہنگامہ پورا کرلیا تھا۔ بارات آنے کے بعد سب لوگ بس بیٹھ کر باتیں کرتے رہے، نکاح پڑھا گیا، خاطر مدارات کی گئیں، اور پھر سب نمازیں اور شبِ براٗت کے اعمال پڑھنے لگے۔ اسی طرح سحر کا وقت ہوا تو ہماری بہن کی رُخصتی ہوئی۔ آج کی نسل ایسی شادی شاید نہ سمجھ سکے گی۔

شادی کے دوسرے روز صبح کو ہم چوتھی کی رسم منانے کے لئے اپنی بہن کو اُن کے گھر سے لینے گئے۔ ویسے تو یہ کام دلہن کے بھائی کرتے ہیں لیکن کیونکہ ہمارا کوئی بھائی نہ تھا اس لئے یہ رسم ہم کو کرنا پڑی، اور پھر یہ کہ ہم بمشکل ۶/سال کے ہوئے تھے۔ ہم اپنی چچازاد بہن کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر اپنی بہن کو لینے گئے، اور ساتھ میں علمدار ماموں بھی تھے جو ڈولی کے ساتھ ساتھ ہاتھوں میں ایک مٹھائی کا ڈبّہ لے کر چل رہے تھے۔ ناشتہ دولہا بھائی کے گھر ہوا اور پھر ہم اپنی بہن کو ڈولی میں بٹھا کر گھر لے آئے۔ ساتھ میں دولہا بھائی بھی تھے۔ سارے رَستے کہاروں کے کندھوں پر یہ ڈولی کافی سنبھلی رہی، زیادہ جھٹکے نہیں لگے۔ ہمارے گھر میں چوتھی اور جوتا چرائی کی رسمیں ہوئیں۔ جوتا چرائی کی رسم میں ہم نے رسم کے مطابق دولہا بھائی کا جوتا چھپا دیا، اور انہوں نے رسم کے مطابق تھوڑی حیل حجّت کی، اور بعد میں ہمیں کچھ پیسے دے کر ہم سے جوتا لے لیا۔

بہن کی شادی کے بعد ہمیں ضامنؔ صاحب نے شاعری سے روشناس کرایا گو کہ ہم ابھی بمشکل ۷ر سال کے ہونے کو تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ہماری بہن کے یہاں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی۔ ہمیں خواب میں کسی نے مشورہ دیا کہ اس کا نام شاہد رکھنا۔ ہمارے خواب پر اعتماد کر کے ہماری بہن نے لڑکے کا نام شاہد حسن عابدی رکھا۔ لڑکے کی پیدائش گھر میں ہوئی، اور رامپور کے سول ہسپتال کے زنانہ حصّہ کی انچارج پارسی لیڈی ڈاکٹر کو پر، ان کی اسسٹنٹ ڈاکٹر جو ایک ہندو تھیں، ہیڈ نرس ناہید، اور کچھ دوسرے کارکُن، غرض ہسپتال کا پورا ہی عملہ گھر پر آ گیا۔ ہم اپنی بہن کو باجی کہتے تھے۔ باجی کی دو ملازمائیں تھیں، ایک رامپوری ملازمہ ''بوا'' اور ایک نوگاواں کی ملازمہ ''بڑی بی''۔ اِن دونوں میں آپس میں سارا دن جھگڑا ہوتا تھا۔ پھر باجی نے شاہد کی آمد پر بوا کے بیٹے ریاست کو بھی شاہد کے کام میں مدد کے لئے رکھ لیا۔ اس کے بعد بڑی بی اور بوا کے بیٹے میں جھگڑا بڑھتا ہی گیا۔ اِن جھگڑوں سے ہماری شاعری کی ابتداء ان مصرعوں سے ہوئی ......

ریاست اور بڑی بی میں بہت ہو گیا جھگڑا، افسوس صد افسوس
آنکھوں سے نہیں سوجھتا، ٹانگوں میں نہیں دم، کمر ہو گئی ہے خم
اس پر بھی بڑی بی نے ہے ریاست کو ہی رگڑا، افسوس صدافسوس

ہم نے یہ ایک پرچہ پر لکھا، اور پھر وہ پرچہ دولہا بھائی کی نظر سے بھی گزرا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ''ارے اصغری، یہ افسوس صدافسوس محرّم کے نوحوں میں لکھنا۔ اب اپنے شعر ہمیں دکھالیا کرنا''۔ اصغری ہمارا دوسرا نام تھا۔ اس کے بعد ہم تقریباً دو سال اپنے دولہا بھائی سے شاعری میں مدد لیتے رہے، اور اس ''جھگڑا'' کے بعد ہم نے کئی سہرے اور غزلیں لکھیں۔

بہن کی شادی کے بعد ہم اُن کے گھر میں کافی آنے جانے لگے۔ لال مسجد پر واقع یہ گھر دو منزلہ تھا اور اس کا کرایہ ۵ر روپیہ مہینہ تھا جو بہت زیادہ تھا۔ وہاں خبر ہوئی کہ اُن کے پڑوس میں ایک ہندو خاندان رہتا تھا۔ ہم میں ایک ۷ر سالہ بچّی کی جستجو تھی، اور ایک دو دن ہم نے صبح کے وقت اپنے گھر کی دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر ان کے گھر میں جھانکا کہ دیکھیں کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ یہ صبح کو اشنان کر کے اور پوجا پاٹ کر کے گھر سے نکلتے تھے۔ اور یہی ہم نے دیکھا کہ ان کے گھر کے سارے مرد کنوئیں کے برابر دھوتی باندھے، پیتل کے لوٹے میں پانی بھر بھر کے نہاتے تھے اور رام رام کرتے تھے جیسے کہ ہم نہاتے

ہوئے کلمہ پڑھتے تھے اور ہیں۔ ان کی عورتیں تلسی کا پتہ اور دیگر کچھ سامان تھال میں رکھ کر لاتیں، اور اسی تلسی اور کنوئیں کے آس پاس گھوم گھوم کر ماتھے پر تلک لگاتی تھیں۔ پھر دو یا تین ہی دنوں کے بعد ہماری بہن نے ہمیں اس طرح جھانکتے ہوئے دیکھ لیا اور اِس پر پابندی لگ گئی۔ پھر ایک دن ہم نے اپنی بہن کو منایا کہ ہندو لالہ جی کے گھر چل کر اُن سے ملنا چاہیئے۔ اُن صاحب کے گھر کا ایک دروازہ دستور کے مطابق ہمارے صحن میں کھلتا تھا، اور ایک دن ہم نے اپنی بہن کے ساتھ کھڑے ہو کر اُسی دروازے کو کھٹکھٹا کے ان لالہ جی کی بیگم کو متوجہ کیا۔ ان کی بیگم نے دروازہ کھولا، اور دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر نمستے کرتے ہوئے ہاتھ اپنے تِلک لگے ہوئے ماتھے سے چھوئے۔ ہمیں اندر بلا لیا اور کہا کہ ''ہمیں پتہ تھا کہ آپ نئے آئے ہیں اور ہم آپ کو بلانے ہی والے تھے''۔ ہماری باتیں دہلیز پر ہی ہو رہی تھیں۔ ہمارے دائیں ہاتھ ان کا صحن تھا اور بائیں طرف لکڑی کی ایک دیوی کی مورتی رکھی تھی۔ لالائن بیگم ساڑی باندھے دیوار کے سہارے کھڑی تھیں۔ پاس ہی ان کا باورچی خانہ تھا۔ اب ہم دونوں بہنیں ان کے بلانے پر بے خیالی میں باورچی خانے کی طرف بڑھے تو انہوں نے ہمیں روکا، کہنے لگیں کہ ''اُدھر مت جایئے، اُدھر میں نے ابھی ابھی چوکا کیا ہے''۔ چوکا چولہے اور اس کے آس پاس کی جگہ پر لیپا پوتی کو کہتے تھے۔ ہندوؤں میں زمین پر یہ لیپا پوتی مٹی اور گائے کے گوبر میں بھوسہ ملا کر ہوتی تھی، اور چولہے پر پنڈول پھیرا جاتا تھا۔ پنڈول وہ مٹی ہوتی ہے جو تختی پوتنے میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ ہم ان لالائن کے ساتھ ان کے دالان میں پڑے ہوئے مونڈھوں پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر بعد بغیر کچھ کھائے پیئے واپس آ گئے۔ پھر اُن کے ہاں ہمارا آنا جانا بڑھ گیا۔

ایک رات اُن لالائن نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا، اور ہمارے دولہا بھائی کو بلانے کے لئے کہا۔ معلوم ہوا کہ لالہ صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ حیرانی تو ہوئی، لیکن دولہا بھائی لالہ کے پاس گئے۔ لالہ صاحب دولہا بھائی کو بالکل نہ جانتے تھے، لیکن اس رات انہوں نے دولہا بھائی کی تمام نسلوں تک کے حالات بتا دیئے اور کچھ اگلے حالات بھی جو بعد میں صحیح ثابت ہوئے، جن میں ہماری بہن کی ایک لڑکی کا ذکر بھی تھا جو خردسالی میں انتقال کر گئی تھیں۔ لالائن نے بتایا کہ لالہ صاحب پر جن آتے ہیں اور اس وقت وہ جن کے اثر میں تھے۔

جن اور بھوت رامپور میں بہت تھے۔ بس ہر تیسرے یا چوتھے گھر میں ایک یا دو صاحبان ہوتے تھے۔ ہندو لوگ ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے کچھ اپنے ٹوٹکے کرتے، اور مسلمان اپنی دعائیں استعمال

کرتے۔ بڑی باجی کی شادی کے بعد ان کا دوسرا گھر محلّہ فراش خانے میں تھا جو ہمارے والد کے گھر کی سمت سے، قلعے کی دوسری جانب، قلعہ کے دوسرے دروازے سے قریب تھا۔ یہ اچھا بڑا گھر تھا۔ لیکن دولہا بھائی ضامنؔ صاحب کا دفتر یہاں سے کافی دور پڑتا تھا۔ اس وجہ سے مکان بدلا اور محلّہ دریبہ میں قلعہ کے اُس دروازے کے قریب گھر لیا جس سے انہیں آنے جانے میں آسانی رہتی۔ یہ گھر رامپور کے معیار کے مطابق چھوٹا تھا، اور دُکانوں کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔ اِس کے سامنے کھلے میدان میں پانوں کے آڑھتی پان فروخت کرتے تھے۔ نئے مکان میں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد ایک روز رات کو ضامنؔ صاحب کے آنے کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ملازم عبدالرحیم نے دروازہ کھولا تو دور دور تک کوئی نہ تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی اور کسی نے اس پر دھیان نہ دیا۔ دوسرے روز پھر یہی ہوا اور اس مرتبہ ہماری باجی بھی عبدالرحیم کے ساتھ نیچے گئی تھیں۔ اب ذرا تشویش شروع ہوئی جو بہت جلد ہی خوف میں تبدیل ہوگئی۔ رامپور میں چوریاں تو ہوتی تھیں لیکن معمولی اچکّوں والی۔ اگر چور گھر میں کسی کی ذرا سی بھی آواز سن لیتے تو سلام یا بعد میں آنے کا وعدہ کئے بغیر بھاگ لیتے۔ پھر برابر کے ان گھروں میں سے رات کو آوازیں آنے لگیں جو خالی تھے اور ان کے باہر تالے پڑے ہوئے تھے۔ اب والد صاحب اور ضامنؔ صاحب نے یہی مشورہ دیا کہ کیونکہ اِن نامعلوم ہستیوں کے ساتھ ہی گزر کرنا ہوگا لہذا یہی بہتر ہے کہ ہر کمرے کے تمام کونوں میں نمازیں اور دعائیں پڑھ کر دفاع قائم رکھا جائے۔ کچھ دنوں بعد ہم کمرے کا دروازہ بند کئے، باجی کے ساتھ کچھ کاموں میں مصروف تھے کہ بند دروازے کی لکڑی میں پڑی ہوئی باریک دراڑ سے گزر کے پہلے ایک چونچ اندر آئی اور پھر چونچ کے پیچھے چونچ کا حامل ایک کبوتر لکڑی کی اِسی دراڑ سے اندر، اور اُس کے پیچھے ایک اور کبوتر اُسی دراڑ سے اندر آ گیا۔ تھوڑی غٹرغوں کرکے کبوتر اُسی دراڑ سے باہر نکل گئے۔ ہماری باجی نے بھی ہمارے ساتھ یہ دیکھا۔ اب کیا تھا، نمازیں، نیاز، اور درود شروع۔ خوف و ہراس پھیل گیا اور نیندیں غائب۔ بعد میں امروہہ سے یہاں آ بسنے والے ایک صاحب کاظم نذر نے مذہبی حفاظت پہنچانے والے گھر کا حصار کرنے کی دعائیں بتائیں۔ یہ دعائیں ہم آج تک استعمال کرتے ہیں۔

باجی کے گھر سے جانے کے بعد گھر کچھ اکیلا سا رہ گیا۔ اماں کی بھی ہمارے اوپر زیادہ توجہ ہوگئی۔ وہ ملازمین کو ہٹا کر ہم سے کھانے پکواتیں۔ والد صاحب مربّوں، چٹنیوں، اور اچار میں مہارت رکھتے تھے۔ ان سے ہمیں یہ چیزیں بھی بنانا آ گئیں۔ کچھ اور چیزیں ہم نے اپنی شادی کے بعد اپنی ساس سے سیکھیں جن میں

شیر مال، کیک، پیسٹری اور دال بھرے پراٹھے اور دال بھرے کریلے شامل تھے۔ یہ پراٹھے نواب کو بہت پسند تھے اور ہمارے سسر کے یہاں سے وقتاً فوقتاً نواب کے دسترخوان کے لئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دو میٹھے کھانے، ایک گلتھی، اور ایک کنگنی کے میٹھے چاول، ہم نے نواب کے ایک باورچی سے ایک تیسرے فرد کے ذریعہ سیکھے۔ اس طرح کے کھانوں میں ہمیں کیوڑہ کا عرق پسند تھا جو پندن کے پتّوں سے نکلتا ہے اور اس کے چند قطرے ایک بڑی دیگ کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ گڑیوں اور گڈوں کے کپڑوں میں تو ہم ماہر ہو ہی چکے تھے، اب کچھ نومولود بھانجے شاہد کی وجہ سے، اور کچھ عمر کی ضروریات کی وجہ سے بھی، ہم انسانوں کے کپڑوں کے بھی ماہر ہوتے چلے گئے۔ سینا پرونا، کاڑھنا، رضائیاں بنانا، اون کے سوئٹر بنانا، غرض یہ کہ ان ساری چیزوں میں ہاتھ صاف ہو گیا۔ اِس طرح آہستہ آہستہ ہماری والدہ اور ہماری بڑی بہن ہمیں اپنے والدین کے گھر سے وِداع کرنے کے لئے تیار کرتے رہے۔ تعلیم کے بارے میں تو ہم پچھلے صفحوں میں پہلے ہی لکھ چکے ہیں۔ ماحول اس طرح کا تھا کہ انسان خود بخود شاعری کی طرف مائل ہو جاتا تھا ......

گڑیوں کی طرح سے ہے سجایا گیا ہمیں
بے جان شئے سمجھ کے بسایا گیا ہمیں

(سلطانہ آدا)

ہماری ہونے والی ساس اور نند نے ہمیں پہلی مرتبہ ایک مجلس میں دیکھا، کہ اکثر شیعہ گھرانوں میں رِشتے اِسی طرح شروع ہوتے تھے۔ کچھ دنوں بعد رشتہ آ گیا، استخارہ دیکھا گیا، اور ہماری شادی ۱۴ رمئی ۱۹۴۴ء بمطابق ۲۱ رجمادی الاوّل ۱۳۶۳ھ بروز اتوار طے ہوگئی۔

ہم نے تو کچھ تفتیش نہیں کی کہ ہمارے شوہر کون تھے اور کس خاندان سے تھے۔ لیکن ہمارے والدین نے خوب دیکھ بھال کی تھی، پھر ہمیں بتایا کہ ہماری شادی کہاں ہوگی۔ ہمارے شوہر کا نام سید ذاکر حسین نقوی تھا، اور وہ دہلی کے اینگلو عربک کالج کے گریجویٹ تھے۔ شادی کے وقت آرمی میں لفٹننٹ تھے، اور نواب کے اے۔ڈی۔سی تھے۔ بعد میں کپتان ہوئے۔ یہ تھے تو برٹش انڈین آرمی میں، لیکن براہِ راست ریاستی فوج میں تھے۔ ریاستی فوج درحقیقت برٹش انڈین آرمی تھی لیکن اس کے اخراجات نواب رامپور اٹھاتے تھے۔ امن کے دور میں یہ ریاست کے استعمال میں رہتی، اور جب بھی انگریزوں کو ضرورت پڑتی، وہ اس کو

اپنے استعمال میں لے آتے۔ ذاکر صاحب جھانسی میں ۱۶ ؍اپریل ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اُن دِنوں اُن کے والد فوج کی طرف سے وہاں تعینات تھے۔ ان کے والد ڈاکٹر امتیاز حسن امروہہ کے ایک بڑے زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور برٹش انڈین آرمی میں سرجن میجر تھے۔ اُن کے دادا مولوی سید اعجاز حسن، اپنے وقت میں امروہہ کے جیّد عالمِ دین تھے۔ مولوی اعجاز صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں جامعہ اظہر، عراق، قم اور رامپور کی رضا لائبریری میں ہیں۔ یہ خود ہی کتابت کرتے تھے اور خود ہی مرتب کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک بڑا سا کتب خانہ تھا۔ یہ خاندان تھا امروہہ کے دادا شاہ ولایت شرف الدّین کا جو ۱۳؍صدی عیسوی میں عراق سے امروہہ آئے تھے۔ ڈاکٹر امتیاز حسن نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے ایف ایس سی، اور پھر برطانیہ میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے سرجری کی ڈگری لی اور ایف۔آر۔سی۔ایس کیا۔ واپس آئے تو اِرادہ تو امروہہ میں ہسپتال کھولنے کا تھا، لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ یہ برٹش انڈین آرمی میں سرجن کی حیثیت سے شامل ہوگئے۔ پھر کافی عرصہ فوج کی طرف سے مختلف جگہوں سے ہوتے ہوئے رامپور کے سِول ہاسپٹل میں آئے۔ ہماری نند نے تقریباً ۱۹۵۲ء میں ہمیں بتایا کہ رامپور میں نواب حامد علی خاں نے ڈاکٹر امتیاز حسن سے اپنے بیٹے کی صحت کے سلسلے میں رجوع کیا تھا۔ نواب حامد علی کے تین بیگمات سے چار بیٹے تھے، جن میں سے ایک بیمار ہوکر پہلے ہی چل بسے تھے اور دوسرے رضا علی خاں اُس زمانے میں بیمار رہنے لگے تھے۔ کوئی ڈاکٹر یا حکیم شفایابی میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ ہماری نند کے مطابق ڈاکٹر امتیاز صاحب نے نواب رضا کی خوراک میں دیر اثر زہر پایا جو ایک لمبے عرصے میں ہلکے ہلکے نواب رضا علی خاں کو ختم کر رہا تھا۔ اس کے بعد نواب رضا کی خوراک مستقل معائنہ میں رہنے لگی اور تا حیات ایسا ہی انتظام رہا۔ جون ۱۹۳۰ء میں نواب حامد علی کا انتقال ہوا، اور ۲۰؍جون ۱۹۳۰ء کو نواب رضا علی نے نوابیت کی تاج پوشی کی۔ اس وقت تک ڈاکٹر امتیاز حسن ریٹائر ہو کے امروہہ واپس جا چکے تھے۔ تاج پوشی کے فوراً بعد نواب رضا نے ان کو ریٹائرمنٹ سے واپس بلوایا، اور اپنے ذاتی معالج کی حیثیت سے ۱۹۵۰ء تک پاس رکھا۔ ۸۰؍سال کی عمر میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی عمر کی وجہ سے علیحدگی لے لی۔ پھر ۴؍جون ۱۹۵۴ء میں اُن کا رامپور میں انتقال ہوگیا اور وہ وہیں دفن ہوئے۔

ڈاکٹر امتیاز حسن نے اپنے چاروں بیٹوں کو اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ ہمارے شوہر کے ایک سگے اور دو سوتیلے بھائی تھے۔ سگے بھائی حبیب حسن لکھنؤ سے زراعت کی ڈگری لے کر نواب کی زمینوں پر بریلی میں زراعتی آفیسر ہوگئے تھے۔ ذاکر صاحب دہلی کے اینگلو عربک کالج سے ڈگری لے کر فوج میں شامل ہوگئے

تھے۔ اِس کالج کا نام سابق ہندوستانی صدر اور ہمارے شوہر کے ہمنام، ذاکر حسین کے نام پر ۱۹۷۵ء میں ذاکر حسین کالج رکھ دیا گیا تھا۔نواب رامپور کے یہاں ملازمتیں ۲۴ ر گھنٹے کی ہوتی تھیں۔ جب اُن کا دل چاہا، جسے چاہا، بلا لیا یا کہیں بھی تعینات کروادیا۔ ہمارے سسر تو تقریباً مستقل نواب کے ساتھ رہتے، اور نواب کی صحت، کھانے، اور خاص طور پر زہر سے بچاؤ کا خیال رکھتے تھے۔ نوابی دور میں پورا پورا خاندان ہی سرکاری ملازمت میں آسکتا تھا۔نواب کا عتاب اُن کی مہربانیوں سے سو فیصد الٹ ہوتا تھا، جو منہ سے نکل گیا وہی قانون تھا۔بس اتنا تھا کہ اُس وقت اتنی ترقی ہو چکی تھی کہ جان محفوظ رہتی تھی۔

تو اِس طرح ہوا تھا ہمارے ہونے والے شوہر ذاکر صاحب کا تعارف۔ اب شادی ۱۴ ر مئی کے دن تھی، اور دِن بے حد گرم تھا۔ اُس وقت دستور یہ تھا کہ دولہا والے گھر سے باراتیوں کو رات کا کھانا کھلا کے نکلتے تھے۔ دلہن کے گھر پہنچ کر پھر دلہن والے خاطر مدارات کرتے، کچھ گھروں میں گانا بجانا، یا بیت بازیاں اور مشاعرے ہوتے، مراثنیں گاتی بجاتیں اور اِسی طرح صبح ہو جاتی۔ نماز کے بعد سورج نکلنے سے پہلے پہلے بارات کو رخصت کر دیتے تھے جیسا کہ ہماری بہن کے ساتھ ہوا، اور یا پھر بارات کو ناشتہ کروانے کے بعد دن چڑھے روانہ کرتے، جیسا کہ ہماری شادی میں ہوا۔ ہماری بارات چوکڑی گھوڑا گاڑی میں آئی تھی جیسے ملکہ وکٹوریہ کی سواری کے لئے ہوتی تھی۔ چار گھوڑوں کی گاڑی چوکڑی، چھ گھوڑوں کی چھکڑی، دو گھوڑوں کی شکرم، اور ایک گھوڑے کی گاڑی ٹم ٹم کہلاتی تھی۔

اس گرمی میں شادی کا مجمع، دلہن کا زیور جس میں شامل تھے پیروں کی جھانجن، تقریباً ایک کلو کی پازیب، لچھے، کڑے، پہنچی، کنگن، چوڑیاں، اور انگوٹھے میں آرسی لگی ہوئی تا کہ دلہن گھونگھٹ کے اندر ہی اس کے شیشے میں اپنا میک اپ دیکھتی رہے......اور پھر لباس جو کچھ اس طرح تھا......۱۲ ر گز کا گھیر دار پشواز نما کرتا، سرخ رنگ کا دوہرا دوپٹہ جس کی اندر کی لہر گلابی اور اوپر کی لہر سرخ تھی، علی گڑھ کٹ کا ہرا پاجامہ، اور پیروں میں کارچوبی والا سلیم شاہی جوتا۔غضب یہ کہ ایئر کنڈیشنگ ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھی، کیونکہ نواب تک کے گھر میں ابھی نہیں آئی تھی اور وہ گرمیوں میں اپنے کمروں کو برف کی سلیں رکھ کے ٹھنڈا کرتے تھے، یا منصوری چلے جاتے تھے۔ بہر حال سارا دن لوگ آتے، چہرہ دیکھتے اور منہ دکھائی کے بعد چلے جاتے، اور اسی میں ہماری کمر ٹیڑھی ہو گئی سر جھکائے زمین پر بیٹھے ہوئے۔ رسم کے مطابق ہماری بارات کے مہمانوں کو دوپہر کا کھانا

ساتھ دیا گیا، جو رواج کے مطابق پُلاؤ اور زردہ پر مبنی تھا۔ رخصتی کے وقت ہمارے والدین کے الفاظ ہمیں اب تک یاد ہیں جن میں انہوں نے ہمیں تاکید کی اور کہا کہ ''اب تمہاری سسرال والے تمہارے خاندان کے لوگ ہیں، اور کبھی لڑ جھگڑ کر اِس گھر مت آنا''۔ یہ بھی ایک رسم تھی جس کے بعد یہ بات ہم نے دوپٹہ کے پلّو میں باندھ لی۔ آجکل بھی پلّو بندھائی کی رسم کچھ لوگ کرتے ہیں، ورنہ تو پلّو چھڑائی کی رسم تو اب جاری ہو ہی چکی ہے، اِدھر سے بھی اور اُدھر سے بھی۔

جہیز میں ہمیں ہمارے والد اور والدہ نے بہت خوبصورت جواہرات دیئے، جس میں سے کچھ ہماری والدہ اور کچھ والد کی طرف سے نسلاً درنسلاً آتے رہے تھے۔ پاکستان آتے وقت، دہلی کے پالم ایئرپورٹ پر کسٹم کی چھان بین کے دوران ہمارے والدین کے دیئے ہوئے یہ جواہرات ہندوکسٹمز نے یہ کہہ کر روک لئے کہ ''آپ کے جواہرات ہندوستانی حکومت روک رہی ہے، یہ رسید رکھ لیں، جب آپ واپس آئیں گی تو یہ جواہرات آپ کو واپس مل جائینگے''۔ اب آپ ان سے لاکھ دلائل دیں کہ یہ پاکستان سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہے، ہم پاکستان ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں اور واپسی کی صورت نہیں ہے۔ لیکن سب بیکار۔ ہندوستان نے پاکستان جاتے ہوئے مسلمانوں کو جتنا لوٹا اور کاٹا مارا، پاکستان سے ہندوستان جاتے ہوئے سکّھوں اور ہندوؤں کو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں بدلہ ملا۔

بہرحال زیورات کے علاوہ ہمیں جہیز میں تانبے اور چاندی کے ہر طرح کے برتن ملے جن میں پتیلیاں، دیغ اور دیغچیاں، اور رکابیاں ملیں، اوران میں ہر برتن کے نیچے ہمارے نام کھدے ہوئے تھے۔ نقش نگاری والے لکڑی کے بڑے بڑے صندوقوں میں لحاف اور بستر تھے۔ کپڑوں کے لئے جست کے صندوق استعمال ہوتے تھے، اور ہمیں بھی ایسے ہی صندوق ملے تھے۔ لکڑی کے پکّے رنگ سے رنگے ہوئے خوان پر مختلف دوسری ضروریاتِ زندگی ملیں جو کہ گوٹا لگے کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ فرش کی چوکیاں جن میں سے چار یا چھ کو ملا کر ان پر سفید چادر بچھا کر اور گاؤ تکیہ لگا کر ایک فرش سا بنتا تھا۔ پھر پردوں کے ساتھ کی مسہری چھپر کھٹ والی بھی تھی۔ یہ سارا سامان کہاروں کی ایک ٹولی سر پر رکھ کر بارات کے ساتھ لے گئی۔

رُخصتی میں بارات تو ویسے ہی گئی جیسے آئی تھی، لیکن دلہن الگ پالکی میں چلتی تھی جسے چار کہار لے کر چلتے تھے۔ یہ سواری بھی خوب تھی۔ ہر قدم پر چار کہاروں کے قدم ایک ساتھ زمین پر لگتے، لیکن پھر بھی سواری کو

الگ الگ چار جھٹکے محسوس ہوتے۔ اِسی لئے ہم نے اپنی بہوؤں بیٹیوں کے لئے موٹر کار کو ترجیح دی۔ ویسے بھی آج کے زمانے میں کہار کہاں ملتے ہیں۔

ہمارے والدین ہماری سسرال سے زیادہ روائتی تھے۔سسرال میں تو جب ہم نے قرآن، نماز اور روزہ پابندی سے شروع کیا تو یہ اُن کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ کافی عرصہ تو ہم کو محرمی عزاداری کے کمرے میں چھپ کر نماز پڑھنا پڑی کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ہم انہیں دکھانے کے لئے پڑھ رہے ہیں۔ کچھ عرصے میں یہ سب بھی خود ہی ہمارے ساتھ نمازیں پڑھنے لگے، اور ہم نے بعد میں اپنی نند اور جیٹھ کے بچّوں کو بھی نماز اور قرآنِ پاک پڑھنا سکھا دیا۔ اس وقت ہماری نند کے تین لڑکے اور ہمارے جیٹھ کے بچے جو اس وقت کل پانچ تھے، سب ہمارے سسر کے بڑے سے گھر میں رہتے تھے اور یہ کنبہ بہت بڑا لگتا تھا۔

رامپور میں رہتے ہوئے بھی کافی ہجرتیں ہوتی رہیں۔ کبھی خاص باغ میں، کبھی شہر میں، کبھی لانسر میں اور کبھی رامپور شکر فیکٹری کے بنگلوں میں رہائش رہی۔ شادی کے بعد ذاکر صاحب کو نواب رامپور کے خاص باغ کا بھی سیکنڈ اِن کمانڈ بنا دیا گیا، جب کہ وہ اے۔ڈی۔سی تو تھے ہی۔ اس وجہ سے ہماری رامپور کے اندر ہی یہ دوسری ہجرت ہوئی۔ ہم فوج کی چھاؤنی کے مکان میں گئے، جو کہ ایک درختوں سے لدے ہوئے علاقے میں تھا، یوکلپٹس اور پھلوں کے درختوں سے بھرا ہوا۔ اس بنگلے میں نو کمرے تھے، سامنے ایک برآمدہ، چبوترہ، اور اندر ایک برآمدہ اور برآمدے کے آگے ایک صحن یا کچا میدان کہہ لیں۔ اس صحن میں امرود کا ایک گھنا درخت تھا اور کچھ ہماری لگائی ہوئی سبزیاں تھیں۔ ہمیں جو گھر ملا اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں کوئی سر کٹا رہتا ہے۔ اس پر یہ کہ ذاکر صاحب کبھی کبھی رات کی ڈیوٹی پر ہوتے، اور اردلی اپنے سرونٹ کوارٹر میں چلا جاتا تھا۔ سسرال والے اپنے شہر کے مکان میں رہتے تھے۔ اب ہم رات کو ریڈیو کی آواز اونچی کر کے پڑھنے یا بننے لگ جاتے تھے، جب تک کہ ذاکر صاحب رات کے ایک بجے گھر نہیں پہنچ جاتے۔ بہر حال کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بھی سر کٹے صاحب کا دیدار نہیں ہوا تو ہم نے فرض کر لیا کہ شاید یہ نیا سر لگوا بیٹھے ہوں گے، اور یا پھر وہ ہجرت فرما چکے ہوں گے۔ لیکن رات کو سنّاٹا اتنا ہوتا کہ ان بھوت صاحب کے بغیر بھی سب بیگمات کو ڈر لگتا تھا۔ تمام بیگمات بھرے گھروں سے آئی تھیں اور ان سب کو اس سنّاٹے کا شکوہ تھا۔ ایک نے تو مزاحاً کہا کہ اگر اُن کے سردار اسی طرح غائب رہے تو وہ سر کٹے صاحب کو قبول کر لیں گی۔ لیکن دونوں نے

کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ ہم کو ایک خوشی یہ تھی کہ یہ جگہ برسات میں بہت حسین ہو جاتی تھی۔ رات کو ہر طرف یوکلپٹس اور پھلوں کے درختوں میں، اور نیچے پودوں میں خاص کر، جگنو چمکتے تھے۔ انہیں ہم کبھی کبھی جھپک کر دوپٹہ میں پکڑ لیتے تھے۔

رامپور کی بہت سی خاص چیزوں میں سانپ اور بچّھو اہم ہیں کہ اِن سے کئی لوگوں کو روزی بھی ملتی تھی۔ اِس بنگلے کے آس پاس تو اُن کی بہتات تھی۔ بنگلے کے قریب ہی کچھ کچے مکان تھے، مالیوں، مہتروں اور بہشتیوں کے لئے۔ یاد رہے کہ بہشتی ایک مشک میں پانی بھر کے گھروں میں پانی ڈالتے تھے، لیکن کیونکہ اس بنگلے میں تو پانی کی پائپ لائن تھیں، بہشتی کا کام صرف مشک سے درختوں کو پانی دینا ہوتا تھا۔ ان ملازمین کے علاوہ ایک ملازم تھے لڈّن خان۔ ان کا کام تھا صرف اور صرف سانپ اور بچھو پکڑنا۔ سارا دن باہر پلنگ پر بیٹھے رہتے، اور جہاں سانپ یا بچھو نظر آیا، ان کو بلایا جاتا۔ لڈّن صاحب انہیں پکڑ کر مٹّی کے گھڑوں میں بند کرتے جاتے۔ گھڑوں میں دسیوں سانپ ہوتے تھے۔ ان صاحب سے پوچھو کہ ڈر نہیں لگتا تو کہتے کہ ''موت سے کیا ڈرنا، جب اللہ تعالیٰ نے لکھا ہوگا تب آئے گی''۔ ہر کمرے کے کونوں میں بڑے بڑے ڈنڈے ہوتے تھے سانپوں سے نپٹنے کے لئے۔ مگر ہم لڈّن صاحب سے ہی سانپ کو بھڑا دیتے، کہ ان کے ذریعۂ معاش کو بھی قائم رکھنا تھا۔ اسی طرح ایک دن ذاکر صاحب نے ہمیں نواب کی محل نما کوٹھی کو دکھانے کے لئے بلایا۔ یہ کوٹھی مختلف عمارتوں پر مشتمل تھی، جن میں بلاک A، بلاک B، اور بلاک C شامل تھے۔ ہم نے بلاک A کے علاوہ پہلے ہی سب اچھی طرح دیکھا ہوا تھا، لیکن بلاک A میں نواب اور بیگم صاحبہ خود رہتے تھے اور وہ نواب کی موجودگی میں عورتوں کے لئے بند تھا۔ اُس وقت نواب منصوری گئے ہوئے تھے لہذا نواب کی منظوری کے بعد ہم وہاں جاسکتے تھے۔ اب ہم وہاں کے لئے تیاری کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھ رہے تھے کہ ایسا لگا جیسے کمرے کے پچھلی طرف کا پردہ زمین کے قریب سے پھٹ گیا ہو، اور اس پر لکیریں بھی پڑ گئی ہوں۔ مڑ کر دیکھا تو ایک کوبرا سانپ منھ میں مینڈک کو دبائے ہوئے دروازے کے بیچ میں لیٹا ہوا تھا۔ ہم تو فوراً چڑھ گئے ایک چوکیوں کے فرش پر اور پھر بلائے گئے لڈّن صاحب۔ جب تک وہ آئے، ایک اور ملازم سید صاحب کمرے میں پڑے ہوئے ڈنڈے سے سانپ کی خبر لے چکے تھے، اور اسی خبر اندازی کے دوران مینڈک بھی بے خبر ہو گیا تھا۔ خیر مینڈک کو تو ویسے بھی بچنے کی امید نہ رہی ہوگی۔

گھر کے قریب ہی ''کوسی'' نام کی ندی بہتی تھی اور آغا پور جاتے ہوئے فوجی دفتر کو پاس کر کے جانا پڑتا تھا۔ رات کو یہاں کا محافظ ہر گزرنے والے کو ''ہالٹ'' کی آواز لگا کر روکتا، اور پھر ''فرینڈ'' کی آواز سن کر جانے دیتا۔ آمدورفت اتنی نہیں تھی کہ یہاں رہنے والی مستورات باہر نہ نکل سکیں۔ ایک دن ہم نے اپنے پڑوسیوں کی کچھ مہمان لڑکیوں کے ساتھ مل کر مچھر دانیوں کے بانس سے چھڑیاں بنائیں، اور ڈوریوں سے مچھلی پکڑنے کی لکڑی بنا کر کوسی گئے۔ یہاں ہم نے اس میں گُھنے لگا کر پانی میں ڈالا اور بیٹھ گئے آلتی پالتی مار کے۔ جب چھڑی ہلتی، اسے نکال کر دیکھتے۔ کبھی مینڈک اور کبھی کچھوے نکلتے اور ہم انہیں پھر پانی میں پھینک دیتے۔ جتنی دیر یہاں رہے، سانپ اور لوگوں کا دھڑکا لگا رہا، اور ہم مچھلی پکڑے بغیر شام سے پہلے گھر آ گئے۔

غرض سرکٹے صاحب اور ان ہی سرسرانے والی ہستیوں کے ڈر سے برا حال رہتا تھا۔ کہتے تھے کہ رامپور میں بھوت تو ہمیشہ سے تھے، لیکن جنّات مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے پہنچے تھے۔ ان وجوہات کی بنا ہمیں جب موقعہ ملتا، ہم اپنی سسرال کے گھر والوں کو یہاں لے آتے۔ سب کے بچّے تو پیدل ہی یہاں آتے تھے۔ اسکول بسیں تو ہوتی نہیں تھیں، اور سائیکل رکھنے والا بھی امیر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم روزآنہ ایک مرتبہ اپنے والدین کے گھر چلے جاتے تھے، اور اس کا کل خرچہ ۴/ آنے تھا اگر ہم کہاروں والی ڈولی سے جاتے۔ اگر ہم تانگے سے جاتے تو کرایہ ۶/ آنے ہوتا تھا۔ یا پھر یہ کہ ہم کِتابوں میں گھرے رہتے۔ میر دبیر، میر انیس، اور علامہ اقبال، سب ہی سے ہم متاثر ہوئے، لیکن ایک جگہ مرزا غالبؔ کیا خوب کہتے ہیں، کہ یہ شعر ایسا لگا کہ جیسے ہماری زندگی کے بارے میں کہا گیا ہو......

چند تصویرِ بُتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

یہ اِس طرح کہ ہم نے شادی کے بعد اپنی زندگی کی پہلی تصویریں اتروانا شروع کیں، اور پھر سینکڑوں تصویریں لے ڈالیں۔ سب ہی جمع کیں اور آج تک حفاظت میں رکھیں۔ ہمارے پاس ہمارے شوہر کے دادا کی ایک خاندانی مجمعئی تصویر بھی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ پرانے زمانے کی سیاہ وسفید تصویروں کے رنگ تو وقت کے اثر سے بہت ہی کم مدہم ہوتے، لیکن رنگین تصویروں پر اثر تیزی سے اور زیادہ ہوتا تھا۔

ذاکر صاحب کا اصول تھا کہ اگر لائن سے واپس گھر آنے میں دیر ہوتی تو اردلی کے ہاتھ رقعہ لکھ کر

اطلاع کروادیتے۔ٹیلیفون اس وقت صرف نواب کے خاندان کے گھروں میں تھے، یا ہسپتال اور حکومت کے کچھ خاص محکموں میں۔ ہم نے اپنے شوہر کے یہ اور وہ سارے خطوط اب تک حفاظت سے رکھے ہوئے ہیں جو انہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران عدن اور دوسری جگہوں سے بھیجے تھے۔ ان کی خوش خطی سے ہماری اولاد اب تک متاثر ہیں، کہ ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح پِرویا ہوا لگتا تھا۔

ایک چیز جو ہم نے اپنے میکہ میں نہیں سیکھی وہ تھا پیسے کا استعمال۔کم عمری میں شادی ہوئی، اور پھر ہمارے والد ہمارے گھر کی ساری خریداری کا انتظام کرتے تھے۔ اگر ہماری والدہ بھی ملازمین سے کچھ سودا سلف منگواتیں تو دکاندار پیسے ملازمین سے نہ لیتے، کہ پیسے کا حساب کتاب تو مرزا صاحب بعد میں کر ہی دیں گے۔ البتہ جو گھروں پر خریداری ہوتی ان کے پیسے ہمارے سامنے ہی سے گزرتے ہوئے سامان بیچنے والے کو جاتے تھے۔شادی کے بعد پیسے خرچ کرنے کی کچھ سوجھ بوجھ آئی۔ اندازہ ہوا کہ نواب کے یہاں سے ہمارے والد کو حکومتی کام کی ماہانہ تنخواہ ۱۷/روپے ملتی تھی، گو کہ والد صاحب کی اصل ذریعۂ آمدنی ان کی دُکان تھی۔ ہمارے بہنوئی کو ڈھائی سو روپے، اور ہمارے شوہر کو سات سو بیس روپے ماہانہ ملتے تھے۔ اس وقت بکری کا گوشت پانچ آنے سیر، اور گائے کا دو آنے سیر تھا۔ ایک سیر تقریباً ایک کلوگرام کے برابر ہوتا تھا اور ایک روپے میں ۱۶/آنے یا ۶۴/ پیسے، اور ایک پیسے میں ۴/ پائی ہوتی تھیں۔غرض یہ رقم اس قدر زیادہ تھی کہ بجٹ وغیرہ کی ہمیں ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ جب پاکستان آئے تو نہ صرف آمدنی کم ہوگئی بلکہ بچّوں کی آمد کے بعد پیسے پیسے پر بجٹ کنٹرول ہوا۔شروع کے کئی سال تو مہنگائی نہ ہونے کے برابر بڑھی، اور پاکستان کے شہرِ کراچی میں ۱۹۵۵ء تک بکرے کا گوشت پانچ یا چھ آنے سیر ہی ملتا رہا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم

ہماری شادی کے دنوں میں دوسری جنگِ عظیم اپنے عروج پر تھی، اور جاپان، چین اور مشرقِ وسطیٰ کے سبھی ممالک جنگ کا میدان بن گئے تھے۔ انگریزوں کو فوج میں لڑنے کے لئے سپاہی اور اُن کے افسران چاہیئے تھے، اور ہندوستان کی افواج کے دستوں کو بھی باری باری بلایا جا رہا تھا۔مستقل ڈر یہ تھا کہ کہیں ہمارے شوہر کی باری نہ آجائے۔لیکن دعائیں کچھ کام نہ آئیں اور اِن کو جولائی ۱۹۴۴ء میں جنگ کے محاذ پر بلا لیا گیا۔ ہماری شادی کو ابھی دو یا ڈھائی ماہ ہی ہوئے تھے۔نواب کی مرتضیٰ انفینٹری اور رضا انفینٹری سے کئی ہزار فوجی

گئے، اورانگریزی حکومت کے ریاستی معاہدے کے مطابق،فوج کا اسلحہ بھی نواب نے فراہم کیا اور دوسرا خرچہ بھی۔ سب گھروں سے رونے اور سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب کو پتہ تھا کہ انگریز جنگ میں اپنی کالونیوں کے فوجیوں کو آگے رکھ کر جرمنی کی فوج سے جنگ کرتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ اگر جاں کا زیاں ہونا ہو تو کالونی کے فوجی مارے جائیں اور انگریز بچے رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ مقصد بھی تھا کہ جنگ کے پہلے ہلّے میں جرمنی کی فوج، کالونی اور ریاستی فوجیوں سے جنگ کرکے کمزور ہو جائے اور بعد میں انگریزوں کے لئے جنگ آسان ہو جائے۔ انگریزوں نے اسی طرح امریکہ کے اصلی باشندوں سے جنگ میں افریقی غلاموں کو آگے رکھا تھا اور وہ "Buffalo Soldiers" کہلائے تھے۔

غرض ان رامپوری فوجیوں کو پہلے ہندوستان ہی میں کچھ نئی تربیت ملی جس میں مشین گن کی نشانہ بازی میں ہمارے شوہر ذاکر صاحب کو خاص نشانی تمغہ ملا۔ پھر انہیں مشرقِ وسطیٰ کے محاذ پر پہلے مصر بھیجا گیا جہاں وہ الاسکندریہ اور قاہرہ گئے، اور پھر عدن جانا پڑا۔ عدن میں ایک بم کے دھماکہ سے ذاکر صاحب کے ایک کان میں سنائی پر اثر پڑا۔ اب آج کل کے زمانے میں تو اس صورت میں حکومتیں کچھ معاوضہ دیتی ہیں، لیکن یہ انگریز کی کالونی کے فوجی تھے، ان کو معاوضہ تو دور کی بات ہے، علاج کے لئے چھٹی بھی نہیں ملی۔

یہاں ذاکر صاحب کی غیر موجودگی میں ہم اپنی سسرال میں رہتے رہے، اور اس دوران ہمارے سسر کو نواب رامپور کے ساتھ رامپور کے اندر ہی ایک بار گھر بدلنا پڑا۔ اس نئے گھر میں گئے تو معلوم ہوا کہ یہ بنگلہ پہلے ایک ہندو کا تھا جس کی بیگم کی وفات اسی گھر کے اس کمرے میں ہوئی تھی جو اتفاق سے ہمارے حصے میں آیا تھا۔ اب کیا تھا، پھر وہی روحوں اور بھوتوں کا خیال نازل ہونے لگا۔ ایک دوبار اپنے کمرے میں سونے آئے تو ایک سیاہ بلّی کو بھاگتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔ یہ سلسلہ کافی دنوں چلا، اور اس کے بعد کچھ آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ حتیٰ کے ایک دن ہمارے سسر نے آکر کچھ دعائیں پڑھیں اور ہمیں بھی بتائیں جس سے کچھ سکون ہوا۔ بھوت پریت تو رامپور میں بھرے پڑے تھے، کچھ کا چرچہ راولپنڈی اور کوہاٹ وغیرہ میں بھی رہا، لیکن کراچی اور امریکہ میں تو بڑی ہی مایوسی ہوئی کہ یہاں ان سے کبھی سامنا نہیں ہوا۔ بھوتوں کو غالباً نئے اور جدید طرز کے گھر پسند نہیں آتے۔

جنگ کے دوران ہر چیز راشن پر ہوگئی تھی اور کافی بعد تک راشن پر رہی تھی۔ مٹّی کا تیل، انڈے،

چاول، آٹا، اور کپڑا، سبھی کے لئے راشن تھا۔ راشن کے سیلا چاول ایسا بدبودار کہ محلے میں اگر کوئی بھی پکائے تو ساروں کو پتہ چل جائے۔ کتنی ہی دفعہ اُبال کے پانی پھینکیں لیکن اس کا پانی گدلا ہی رہتا تھا۔ اچھے معیار کی تمام چیزیں انگریز سرکار کی ہوگئیں اور ہندوستانیوں کے لئے اچھی چیزوں کا کال پڑ گیا تھا۔ نواب نے اناج کے کافی بڑے ذخیرے جمع کر رکھے تھے کہ اگر جنگ اور لمبی چلتی تو یہ چیزیں کام آتیں۔ انہوں نے یہ اچھے معیار کی چیزیں رامپور کے لوگوں میں بھی تقسیم کیں۔ دوسری طرف تمام اشیاء کی قیمتیں آسمان کی طرف پرواز کر گئیں تھیں۔ گندم جو ایک روپے کا ۱۶/سیر ملتا تھا، ایک روپیہ میں صرف ۵/سیر رہ گیا۔ چینی ایک روپیہ میں چھ سے صرف چار سیر رہ گئی، اور دودھ ۲/آنے سیر ہوگیا۔ سب سے زیادہ مہنگائی پیئرز (Pears) صابن جیسی اشیاء میں ہوئیں جو برطانیہ سے آتی تھیں۔ اس صابن کی قیمت ۹/آنے ہوگئی، جب کہ گائے کا گوشت مہنگا ہونے کے بعد بھی صرف ڈھائی آنے سیر تھا۔ ساری دوائیں بازار سے غائب ہوگئی تھیں، لیکن ہمارے سسر نواب کے یہاں سرجن تھے اور اس لئے ہمیں دواؤں کے لئے اتنی تکلیف ویسے بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے گھر میں تو صرف ہندوستانی دوائیں چلتی تھیں اور یا دعائیں۔ اب شکرِ خدا بھیجتے ہیں کہ ہم سب ماشاللہ اس دور سے صحیح سلامت نکل آئے، سوائے ہماری پہلی اولاد کے۔ یہ ایک خوبصورت بچّی تھی جو بالکل ہی معمولی ناسازئِ طبیعت کی بنا چل بسی تھی۔

ہمارے شوہر نے محاذِ جنگ پر رہتے ہوئے بھی خطوط بھیجنے کی عادت نہ جانے دی۔ تمام حالات اور نقشۂ جنگ ان خطوط میں ہوتے تھے۔ خطوں کے آنے کا کوئی صحیح بھی نہ تھا کہ پہنچ گیا تو پہنچ گیا ورنہ اگر طیّارہ گرا یا سفینہ ڈوبا، اور یا جیپ بم کے گولے سے تباہ ہوگئی تو ڈاک بھی غائب۔ اسی طرح ہم کچھ اخبارات اور کچھ ان خطوط سے اپنے آپ کو سنبھالے رکھے رہے اور سمجھتے رہے کہ کیا ہو رہا تھا، اور آگے کیا ہوسکتا تھا۔ کبھی انہی چیزوں کو سمجھنے اور سوچنے میں ہم بہت آگے نکل جاتے تھے۔ ہم نے یہ تمام خطوط اور تمغے بہت حفاظت سے رکھے اور دسیوں ہجرتوں کے بعد ابھی بھی یہ خطوط ہمارے پاس ہیں۔ لیکن اب یہ سب کاغذات گل گئے ہیں اور تمغے زنگ کھا رہے ہیں۔ ہر انسان اور ہر شئے کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔

جنگ نہ جانے کب تک چلتی، لیکن جب ہٹلر نے اپریل ۱۹۴۵ء میں خودکشی کی یا اسے قتل کیا گیا تو جرمن فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور پھر اس سال کے آخر میں ذاکر صاحب عراق، ایران، اور افغانستان

سے ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ دہلی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد ذاکر صاحب کو ایک دن کے لئے رامپور میں گھر آنے کی اجازت ملی اور دوسرے ہی دن وہ واپس دہلی چلے گئے جہاں خیبر لائنز میں فوج کو روکا ہوا تھا۔ البتہ یہ ہوا کہ ہمارے شوہر اور دوسرے فوجیوں کو اپنے خاندان کو دہلی بلانے کی اجازت ملی تھی، اور ہم تو اکیلے ہی تھے، دہلی چلے گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے ہمارے رہنے کا انتظام کیا اور ہم اپنے ایک رشتہ کے بھائی، فضل بھائی کے ساتھ دہلی پہنچ گئے۔ یہ فضل بھائی بعد میں رامپور کے اندرونی معاملات کے وزیر بن گئے تھے۔ دہلی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد ذاکر صاحب کو میرٹھ میں ۱۴/ دن کے لئے آرمی کے ایک کورس پر بھیج دیا گیا اور ہم بھی ان کے ساتھ گئے۔ اس کورس میں انہیں جنگی میدان میں حملہ اور دفاع کی صورتوں میں نقشوں کا استعمال سکھایا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ گھوڑ سواری بھی سکھا دی گئی۔ میرٹھ میں ۱۵/ دن قیام کے بعد ہم دہلی آ گئے۔

دہلی میں کچھ ہی ہفتے ہوئے تھے کہ ان فوجیوں کو لاہور سے ہوتے ہوئے کوہاٹ جانے کے لئے ہدایت آ گئی۔ کوہاٹ میں کچھ عرصہ گزار کے واپس رامپور پہنچے تو حالاتِ زمانہ نے نئی صورت اختیار کر لی تھی۔ فوجیں حکومتِ برطانیہ کو بچانے کے لئے استعمال ہو رہی تھیں اور انہی فوجیوں کے عزیز واقارب برطانوی حکومت کو ٹھکانے لگانے کا عہد کئے بیٹھے تھے۔ ہنگامے ہو رہے تھے اور عوام پِٹ رہے تھے۔ گھروں میں لوگ کانگریسی اور مسلم لیگی ہو گئے اور تفرقہ ہو گیا۔ لاٹھی چارج ہوتا رہا اور پورا ۱۹۴۶ء اسی طرح گزرا کہ ہر مرد، سر اور بازوؤں پر مرہم لگی پٹّیاں باندھے دن گزارتا رہا۔ اب انگریز اور امریکی امن پسندی کی باتیں کرتے ہیں لیکن پاکستانی اور ہندوستانی عوام یہ کیسے بھول جائیں کہ ہندوستان سے انگریزوں کو درحقیقت مار کے نکالا گیا تھا اسی طرح جیسے ان کو ترکی سے مار کے نکالا گیا تھا۔ اگر اس وقت کے مسلمان، اور وہ ہندو کہ جنہوں نے گاندھی جی کی پُرامن تحریک کا ساتھ نہیں دیا تھا، رام رام کر کے بھوک ہڑتالوں سے انگریزوں کو نکالنے کی کوشش کرتے رہتے تو انگریز ان کو اسی طرح بھوک ہڑتال میں مرنے دیتے جیسے مارگریٹ تھیچر نے آئرلینڈ میں آئرش آزادی پسندوں کو ۱۹۸۱ء میں مرتے دیکھ کر بھی آئرلینڈ کو آزادی نہیں دی۔ گاندھی جی کا بھی وہی حشر ہوتا جو آئرش ریپبلکن آرمی کے بابی سینڈز (IRA-Bobby Sands) اور اس کے ۹/ دوسرے ساتھیوں کا ہوا۔ یہ سب ہی تقریباً ۴۰/ سے ۷۰/ دن بھوکے رہ کر مر گئے اور بعد میں تمام دوسرے بھوک ہڑتالیوں کو زبردستی رگوں میں ڈرپ لگا کر خوراک دی گئی تھی۔ لیکن جہاں تک آزادی کا تعلق ہے، وہ آج تک نہیں ملی اور مارگریٹ تھیچر ٹس سے مَس نہ ہوئیں۔

تقسیمِ ہندوستان، قیامِ پاکستان اور ہجرتِ اوّل

ہماری شادی تقریباً چودہ سال کی عمر میں ہوئی۔شادی کے دو ماہ بعد ہی شوہر جنگِ عظیم میں شمولیت کے لئے چلے گئے۔وہ واپس آئے ہی تھے پاکستان بننے کا ہنگامہ اور پھر یہ سب حالات ایسے تھے کہ پتہ ہی نہ چلا کہ بچپن کب گزرا اور کب جوانی آئی۔اسی دوران ایک بچی پیدا ہوئی تھی، جو انہی سخت حالات میں ایک بالکل ہی معمولی ڈائیریا کی وجہ سے چل بسی۔ان حالات نے ذہن جھنجھوڑ کر رکھ دیا،لیکن دین نے اور دینی کتابوں نے ہمیں سہارا دیا۔اس زمانے کے ہمارے اپنے اشعار ہمارے حالات کی عکاسی کرتے ہیں......

دیکھا چمن میں میں نے یہ بلبل کا حالِ زار
منقار رکھے عارضِ گل پر ہے بیقرار
پوچھی جو وجہِ گریہ تو کہنے لگی آدا
کیا پوچھتی ہو، خوفِ خزاں سے ہے دل فگار

(سلطانہ آدا، رامپور، ۱۹۴۷ء)

لیجیئے ! ۱۹۴۷ء شروع ہوگیا۔تقسیمِ ہندوستان کا اعلان قریب تھا، اور رامپور کے عوام کے ذہن مسلم لیگی تھے۔ انگریزوں نے بھوپال، جونا گڑھ، حیدرآباد دکّن، کشمیر، رامپور، اور ایسی دوسری ریاستوں کو یہ آزادی دی کہ وہ یا تو آزاد رہیں، اور یا پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ سطحی طور پر تو یہ بات قائدے کی لگی کیونکہ انگریزوں نے ان ریاستوں کو بناتے وقت کچھ معاہدے کئے تھے، لیکن ذرا بلندی سے اسی صورتحال کو دیکھیں تو صاف ظاہر تھا کہ یہ انگریزی وائسرائے ماونٹ بیٹن کی چال تھی اور اس کا فائدہ صرف اور صرف گاندھی اور ہندوستان کو ہوسکتا تھا۔انگریزوں نے ہندوستان مسلمانوں سے لیا تھا، اور اگر انہیں اپنے ماضی کا اتنا ہی خیال تھا تو انہیں ہندوستان سے اپنا وجود خارج کرتے وقت پورا ہندوستان ہی مسلمانوں کے حوالے کرنا چاہیئے تھا۔اب انگریزوں کو پورا اندازہ تھا کہ حیدرآباد دکّن اور رامپور جیسی ریاستیں تو چاروں طرف سے ہندوستان میں گھری ہوئی تھیں اور ان کا تو پاکستان سے ملنا حقیقتاً ناممکن تھا۔ جونا گڑھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی قریب قریب ایک جیسی آبادی تھی، اور وہاں کے راجہ مہبت خانجی نے پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان ۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو کیا، اور فوراً ہی گاندھی نے وہاں فوج کشی کر کے اسے

ہندوستان میں شامل کر لیا۔ حیدر آباد کی بھی یہی کیفیت رہی۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اور اس کو پاکستان میں شامل نہ کرنا لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا مسلمانوں سے سب سے بڑا دھوکا تھا۔

لیاقت علی خاں صرف ایک رات کے لئے رامپور میں رکے، اور انہوں نے ایک تقریر کی۔ اس سے ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ تمام کانگریسی ششدر رہ گئے۔ ہر ایک پاکستان اور مسلم لیگ کے ساتھ ہو گیا، اور انہی کے لئے ووٹ دیئے گئے۔ اسی طرح لکھنؤ، بریلی، کانپور، مراد آباد، رائے بریلی، امروہہ، سرسی، اور میرٹھ سے مل کر مسلمانوں کی ایک پٹّی سی بنتی ہے جو کشمیر سے ملتی ہے۔ لیکن یہ پٹی کشمیر سے ہوتی ہوئی پاکستان سے کیوں نہ ملی، یہ ہمیں ابھی بھی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ کچھ ماہ بعد جب ۱۹۴۸ء میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے، جو اس وقت ہندوستان کے نائب وزیر اعظم تھے، یہ اعلان کر دیا کہ وہ تمام ریاستوں کو ہندوستان کی حکومت میں ضم کریں گے۔ کیونکہ یہ ایک بہت پُر عظم ہستی مشہور تھے، لہذا سب ہی کو اندازہ ہو گیا کہ اب ریاست رامپور ہندوستان میں ضم ہو جائیگی اور نواب رامپور کا ریاست پر راج بھی ساتھ میں ختم ہو جائیگا۔ رامپور میں نواب رضا علی خاں کو اُن تمام انگریزی اور ہندوؤانی چالبازیاں کا علم وہاں کے عوام سے زیادہ رہا ہوگا۔ ہمارا ذاتی اندازہ یہ ہے کہ یہی دیکھتے ہوئے نواب نے ریاست رامپور کو ہندوستان سے ملانے کا فیصلہ کیا جب کہ نواب خود بھی مسلم لیگ کو کافی چندہ دیتے رہے تھے، اور رامپور کے زیادہ تر عوام مسلمان تھے۔ رامپور میں ہندو مسلم فساد تو ناممکن ہی تھے، لیکن نواب کے اس اعلان کے بعد شیعہ اور سنیّوں کے فسادات کی آگ پھیل گئی۔ نواب اہل تشیع تھے، اور شیعہ عوام کے گھر محفوظ نہیں رہے۔ نواب کی اپنی پولیس اور فوج بھی اس ''رافضی'' یعنی شیعہ نواب کے خلاف ہو گئی، اور شیعوں کے گھر، دکانیں اور کارخانے سب ہی جلنا شروع ہو گئے، انہی میں رامپور کے وزیرِ اعلیٰ بشیر حسین زیدی کے والد کا کمبلوں کا مشہور کارخانہ تھا۔ مختلف دیہاتوں میں صورتحال زیادہ بُری تھی کیونکہ وہاں پولیس کا انتظام برائے نام ہی تھا۔ اس بناء پر ہمارے شوہر کو ان کی مرتضٰی انفینٹری کے ساتھ گاؤں کے شیعہ خاندانوں کو حفاظت سے لانے کے لئے بھیج دیا گیا اور ایک ہفتے تک ان کے اَتے پتے کی ہمیں خبر نہ ہوئی۔ راستوں میں ان لوگوں نے جگہ جگہ سڑکوں میں گڑھے کھود کر ان میں جانوروں اور انسانوں کی گندگی بھر دی تھی اور درخت کاٹ کر گرائے ہوئے تھے۔ لیکن فوج ان سب حالات کا مقابلہ کرتی ہوئی جن لوگوں کو بچا سکی، بچا کر لے آئی۔ ایسے ایسے واقعات ہوئے کے جن کو سمجھنا انسانی سائکالوجی میں ڈگری لینے کے برابر ہوتا تھا۔ سنیّوں کا ایک گروہ جب مٹی کے تیل کا کنستر لے کر ہمارے سسر ڈاکٹر امتیاز حسن کے گھر پہنچے تو پڑوس کے

سارے سنّی گھر سے باہر نکل آئے اور کہنے لگے کہ پہلے ہمارے گھر جلاؤ تو پھر ڈاکٹر صاحب کا گھر جلانا۔ مجمع کے مختلف گروہوں کے سرغنہ حضرات کو جب خبر ہوئی کہ یہ گھر ڈاکٹر امتیاز حسن کا ہے تو انہوں نے خود ہی اپنے لوگوں کو یہ گھر جلانے سے منع کر دیا۔ اسی طرح ہمارے والد اور ہمارے بہنوئی کے گھروں کو ان کے محلّہ کے سنّیوں نے بچایا۔ لیکن تھوڑا ہی آگے جا کر ریاست کے ایک تحصیل دار کے گھر کو سب مل کر آگ لگاتے رہے اور تیل پھینکتے رہے جیسے کہ وہ ثواب کا کام تھا۔ ان حالات سے جو لوگ گزرے ہیں انہوں نے اپنوں کو دم توڑتے دیکھا، گھر جلتے اور لٹتے دیکھے، عورتوں اور بچوں پر ظلم ہوا۔ کتنی برادریاں اور کتنے محلّے ان ہنگاموں سے ختم ہو گئے۔

۱۴ر ستمبر ۱۹۴۷ء، بمطابق ۲۷ر رمضان ۱۳۶۶ھ کو پاکستان کی سرزمین پر پاکستانی پرچم لہرایا گیا۔ ان دنوں ہم سب لوگ تمام دن خبروں کے دوران ریڈیو کے گرد بیٹھے رہتے اور خبریں سنتے رہتے تھے۔ ہر اخبار پڑھا جاتا تھا۔ ہر گھر میں ریڈیو بھی نہ تھا۔ ہمارے گھر کی مردانی بیٹھک میں، جسے آجکل ڈرائینگ روم کہتے ہیں، ایک ریڈیو سیٹ رکھا جاتا تھا اور پورے محلّے کے مرد حضرات شام کی خبروں، اور پھر رات کی خبروں کے لئے جمع ہوتے تھے۔ اسی طرح ہماری بہن اور والد کے گھروں پر لوگ جمع ہوتے اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے تھے۔ اکثر لوگ پاکستان جانے کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔ نہ معلوم کتنے خاندان جا چکے تھے، اور گھروں اور محلّوں میں سنّاٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ نوجوان لوگ تو پاکستان ہجرت کر رہے تھے لیکن صاحب عمر خواتین و حضرات میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ایک نئے ملک میں اپنی نئی زندگی بنائیں۔ جن کے پاس بڑی جائدادیں تھیں وہ اونے پونے جائدادیں بیچ کر چلے گئے۔ ہمارے والد کے چچا آگرہ میں شاہ گنج میں احمد منزل میں رہتے تھے۔ بہنیں پہرسر میں رہتی تھیں۔ سب بھائیوں کے محل سرا نما گھر تھے۔ ان کے گھر سکّھوں کا ایک گروہ آیا اور یہ رحم کیا کہ انہیں صرف جسم پر پہنے ہوئے کپڑوں میں گھر سے بمبئی جانے دیا، ورنہ دوسرے تو زندہ بھی نہ بچ سکے تھے۔ یہ لوگ بمبئی میں اپنے ایک چچازاد بھائی کے ساتھ کہ جو فوج میں تھے، ایک فوجی کانوائے کے ساتھ گورکھپور سے ہوتے ہوئے کراچی آئے اور کئی مہینوں تک یہ ۲۵ر افراد پر مشتمل خاندان جہانگیر روڈ پر دو کمروں کے گھر میں رہا جہاں ایک ہی اجابت خانہ تھا۔ کئی سالوں میں یہ لوگ محنت کر کے پھر اوپر آتے رہے اور آج پھر ماشاللہ معاشرتی اور اقتصادی طور پر اونچے معیار پر ہیں۔ یہی ہے کہ دودھ کی بالائی ہمیشہ اوپر ہی آتی ہے، نیچے نہیں دبائی جا سکتی۔

نواب رامپور نے ان لوگوں کی مدد کی جو پاکستان جانا چاہتے تھے، لیکن انہوں نے کوشش یہی رکھی کہ ان کے اپنے ملازمین اور فوج کے لوگ ان کے ساتھ ہی رہیں۔ انہوں نے لوگوں کو دہلی تک پہچانے کے لئے ٹرینوں پر ٹرینیں بھیجیں۔ ان ٹرینوں پر نواب کی فوج کے حفاظتی دستے ہوتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ تین ٹرینیں دہلی گئیں اور واپس نہ آئیں۔ اس پر نواب نے فوج کے زیادہ تجربہ کار اور اوپری عہدے کے افسران کو تفتیش کے لئے دہلی روانہ کیا۔ اس میں ہمارے شوہر بھی تھے۔ خود ہمیں اور دوسرے فوجی افسران کی بیگمات کو ایک بنگلے میں جمع کر کے باہر صرف ایک فوجی سپاہی کھڑا کر دیا تھا جس کے پاس صرف ایک مشین گن تھی۔ سب خواتین ساری رات دعائیں اور کلامِ پاک پڑھتیں اور اس طرح ہم نے اس جگہ آٹھ دن گزارے، تب کہیں جا کر اپنے شوہر سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب یہ واپس آئے تو اکثر دوسرے فوجیوں کی طرح ان کی بھی طبیعت صحیح نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے وہاں یہ دیکھا کہ ان ٹرینوں میں جانے والے خاندانوں کی لاشیں ٹرینوں سے اٹھا کر دریا برد کی جا رہی تھیں، اور مردہ لاشوں کی گندگی سے طرح طرح کے امراض پھیل رہے تھے۔ کچھ مہاجرین جو مشرقی علاقوں سے آ رہے تھے ان کے لئے نواب نے حکم جاری کیا کہ نواب کے ملازمین میں سے ہر ایک ان میں سے ایک خاندان کی میزبانی کرے گا۔ ہمارے حصے میں بھی مظفرنگر کا ایک خاندان آیا، اور یہ اگلا محرم اسی خاندان کے ساتھ گزر گیا۔

جو لوگ خوشی خوشی اور جوش وخروش سے پاکستان روانہ ہوئے وہ بھی اتنے اچھے نہ رہے۔ ہمارے شوہر کے ایک دوست تقی مرزا ابنِ یوسف مرزا اپنے سارے خاندان کو لے کر سندیلے کے شہر دہلی چلے اور وہاں سے ان کی لاہور جانے کی نیت تھی۔ لیکن دہلی میں بھی ہنگامے ہو رہے تھے، اور ان ہی ہنگاموں کے نتیجہ میں ان صاحب کی بیگم ایک ہسپتال میں زخمی حالت میں اپنی چھوٹی عمر کی بیٹی کے ساتھ داخل تھیں۔ رات کے قریب ایک ہندو نرس نے انہیں بتایا کے اس دن رات کو ہسپتال پر حملہ ہوگا، اور ہندوؤں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر سارے مسلمان مریض ان کے حوالے نہ کئے گئے تو وہ ہسپتال کو اڑا دیں گے۔ اس کو سننے کے بعد یہ صاحبہ اپنی بچی کو اپنے دوپٹے سے سینے پر باندھ کر رینگتی ہوئی ہسپتال کے بیرونی دروازے تک آئیں اور یہاں ان کے شوہر کو نرس نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ اب یہ تین افراد دہلی سے لاہور کے لئے ٹرین میں سوار ہوئے تو راستے میں ٹرین پر بھی حملہ ہوگیا۔ گو کہ فوج اور پولیس سب موجود تھی لیکن ہندو مجمع کی افرادی اور جذباتی قوت کے سامنے یہ بیکار تھی۔ ٹرین میں زبردست خون خرابہ ہوا اور یہ خاندان لاشوں کے نیچے دبے دبے لاہور پہنچا

تھا۔ جب ہم ان لوگوں سے کئی سال بعد کراچی میں ملے تو ان کی بیگم کے سینے میں ایک گہرا خلا سا دیکھنے کو ملا۔ ان کی بیٹی کے ماتھے اور جسم کی دوسری جگہوں پر زخموں کے نشانات تھے۔ بس یہی ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ یہ خاندان دوسرے لوگوں کی طرح پاکستان کی محبت میں پاکستان آیا اور گھر سے بے در ہوا، ورنہ مذہب کی آزادی تو ہندوستان میں اس وقت بھی تھی اور ابھی بھی ہے، اور مالی طور پر سب ہی خاندان نہ صرف لٹے پٹے، بلکہ بالکل ہی برباد ہوگئے تھے۔ اب امریکہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دوسرا فرد یا خاتون اپنے ذاتی واقعات پر مبنی کہانیاں لکھ کر اور فلمیں بنوا کر فخر کرتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ آزادئ پاکستان کے دنوں میں کتنی کہانیاں بنیں اور کتنی کہانیاں بننے سے پہلے ہی تمام ہوگئیں۔

کچھ لوگ اپنے آبا ؤ اجداد کی قبروں کو چھوڑ کر جانے کے لئے بالکل تیار نہ ہوئے۔ انسان اپنی برسوں کی ساکھ اور اپنی جمی جمائی گھرستیاں چھوڑے تو دل دکھتا ہے۔ جانور کا بھی تھان بدلو تو دو تین دن تک وہ چارے کو منہ نہیں لگاتا ہے۔ ہم صحیح معنوں میں ابھی سترہ اٹھارہ سال ہی کے تھے اور ہم ہر چیز اور ہر واقعہ کو صرف دیکھنے کی صورتِ حال میں تھے، گو کہ پرکھنا اب شروع کر دیا تھا۔ ہمارا نئی چیزیں سیکھنے کا پیمانہ بہت تیزی سے اوپر جا رہا تھا۔ ہمارے والد اور والدہ، اور بہن کا خاندان پاکستان نہیں آئے۔ اتنی عمریں ہو چلی تھیں اور اب پاکستان کے لئے جذبہ ہونے کے باوجود پاکستان آنا حقیقت پسندانہ عمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ہمارے والد، والدہ، بہن اور ہمارے بہنوئی رامپور ہی میں فوت ہوئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ ہمارے بہنوئی کی نواب سے اتنی قربت تھی کہ انہوں نے ان کو مقبرہ جنابِ عالیہ میں ہی دفن کی جگہ دی۔ ہمارے سسر بھی اپنی عمر کی وجہ سے پاکستان نہیں آئے اور رامپور ہی میں مدفون ہوئے ......

ے اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

ہمارے شوہر کو پاکستان جانے کا خیال شروع سے تھا۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں فوج سے چھٹی لی، اور پاکستان دیکھنے کے لئے کراچی آ گئے۔ نواب سے چھٹی لینے کا خیال بھی نہ آیا۔ اس وقت سرحدیں کھلی تھیں اور ویزا یا پرمٹ شروع نہیں ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ کراچی میں گزار کر جب واپسی کا ارادہ کیا تو پرمٹ شروع ہو چکے تھے۔ اب پریشانی کہ واپسی کس طرح ہو۔

کراچی میں ہمارے شوہر ایک اوپری عہدیدار جناب اے۔ ٹی۔ نقوی سے ملے جنہوں نے ان کو

رکنے کی دعوت دی اور ناظم آباد کی زمین لینے کو کہا جو صرف ڈیڑھ یا دو روپے گز مل رہی تھی، لیکن لسبیلہ اور لیاری ندّی کے دوسری طرف صرف جنگل بیابان تھا اور کیکٹس کے خاردار پودے تھے۔ ہمارے شوہر نے اس زمین کو دیکھ کر صاف انکار کیا، اور واپسی کا ارادہ پکّا کرلیا۔ بہرکیف ان کو واپسی کی اجازت ملنے کے لئے نواب سے پوچھ گچھ ہوئی۔ جب یہ واپس رامپور پہنچے تو فوج سے تو چھٹی لے کر گئے تھے، لیکن نواب سے کافی بدمزگی ہوئی۔ اس کے بعد ہمارے شوہر نے پاکستان جانے کا ارادہ پکّا کرلیا۔ ویسے بھی نواب اور ہمارے شوہر کے تعلقات اچھے نہ رہتے تھے اور دونوں ہی غالباً ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ نواب رضا علی خاں کے پسر مرتضٰی علی خاں کی شادی ہورہی تھی، اور نواب نے بہت بڑے انتظامات کئے تھے۔ ان میں خاص خاص مہمانوں کو لانے کے لئے خاص ریل گاڑیوں کا انتظام، رتھوں کی بارات، آتش بازی اور مختلف جلوس شامل تھے۔ اس کے علاوہ دلہن کے لئے قلعے کے شیش محل کے برابر ایک نئی عمارت بنانا تھی اور نواب اپنے مصاحبین کو ملبہ اور مٹی کا ڈھیر دکھاتے ہوئے زبانی ہی عمارت کا نقشہ بتا رہے تھے۔ سب تعریف کر رہے تھے لیکن ہمارے شوہر خاموش رہے۔ نواب نے اُن کی رائے پوچھی، تو انہوں نے جواب دیا کہ ''عمارت اور نقشہ دیکھے بغیر تو کوئی رائے مشکل ہی ہے''۔ نواب کو یہ سخت ناپسند تھا کہ کوئی اُن کی ہاں میں ہاں نہ ملائے۔

اسی دوران پاکستان کے شہر کوہاٹ سے دو ہزار ہندو اور سکھ رامپور لاکر بسائے گئے جنہیں یہاں شرنارتھی کہا جاتا تھا جیسے کہ پاکستان میں آنے والوں کو مہاجر کہا جاتا تھا۔ ہر دور میں وہی لوگ زیادہ کچلے گئے جو اس دور کے حالات کی خرابی کے ذمّہ دار نہ تھے۔ اب جہاں ہندوستان کے مسلمان ہندوستان میں تکلیفیں سہ رہے تھے، یہ شرنارتھی بھی تکلیفیں سہنے لگے۔

ہمارے جیٹھ حبیب حسن اپنی دوسری بیگم کو لے کر بریلی سے ڈھاکہ ہجرت کر گئے، اور یہ ہجرت انہوں نے اپنے والد یعنی ہمارے سسر کو، اور نواب کو بتائے بغیر کی۔ یہ بریلی میں نواب کے محکمۂ زراعت میں اگریکلچرل آفیسر تھے، اور ڈر یہ تھا کہ نواب صاحب ان کو جانے نہ دیں گے۔ یہ حالات ایسے ہی تھے جیسے آج کل پاکستان میں اٹامک انرجی کے محکمہ کے لوگ ملک نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد ہمارے سسر اور نواب میں کچھ ناچاقی ہوئی اور ہمارے سسر نے ۸۰ رسال کی عمر میں نواب کو استعفٰی دے کر ریٹائرمنٹ لے لی۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کے سردار ولبھ بھائی پٹیل نے حیدرآباد کا رخ کیا۔ اس سے پہلے دکّن

میں قاسم رضوی کی سیاسی جماعت بہت اوپر جارہی تھی۔ حکومتِ حیدرآباد نے رامپور کے برٹش انڈین آرمی کے ریٹائرڈ فوجیوں کو دکّن کی فوج میں شامل ہونے کے لئے اورنگ آباد بلایا۔ اس میں ہمارے جاننے والوں میں سے بہت سے افسران گئے، اور ہمارے شوہر بھی گئے۔ لیکن دو ماہ بعد ہندوستان کی فوج کی حیدرآباد کے اوپر پیش قدمی اور ریاست کے جبراً ہندوستان میں ضم ہونے کے بعد یہ سب واپس رامپور آ گئے۔

۱۹۴۹ء میں رامپور کی فوج کو ختم کر دیا گیا اور ہمارے شوہر ہندوستانی فوج میں شامل ہونے کے بجائے ریٹائرمنٹ زیادہ پسند کی۔ ان کی ڈیڑھ سو روپے ماہانہ کی پینشن مقرر کی گئی۔ لیکن پھر یہ راولپنڈی آ کر ۱۹۵۱ء میں پاکستانی فوج میں شامل ہو گئے، اور ان کو ہندوستانی حکومت سے نہ پینشن ملی اور نہ ہی گریچویٹی، اور نہ ہی پاکستان کی فوج نے ان کے اس نقصان کی تلافی کرنے کی ذمہ داری لی۔

اب رامپور کہاں

والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کا مرثیوں کا بستہ ہم کو ورثہ میں ملا، اور اُن کی واحد یہی چیز تھی جو ہم پاکستان لا سکے تھے۔ اس کے بعد کئی سالوں کے بعد ہم کچھ مزید کتابیں بھی لائے۔ اب امریکہ ہجرت کی تو وہ کتابیں بھی پاکستان رہ گئیں، اور امریکہ میں پیدا ہونے والی ہماری اولاد کی نئی نسل تو انگریزی بولنے والی ہے اور اردو سے بے خبر۔ آگے یہ بھی نہیں معلوم کے ان کتابوں کو کوئی پڑھے گا بھی یا نہیں۔

ایک مرتبہ دولہا بھائی بھی پاکستان آئے، نواب رامپور کے ساتھ۔ ان کی بیگم سے ملاقات ہوئی اور ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔ نواب رامپور کا انتقال ۶/ مارچ ۱۹۶۶ء کو ہوا۔ چھ مہینے تک ان کی میّت مقبرہ جنابِ عالیہ میں رہی، اور پھر جب کربلائے معلیٰ میں دفنانے کی اجازت مل گئی تو میّت وہاں بھیج دی گئی۔

بعد میں ہم کئی مرتبہ ہندوستان گئے۔ رامپور بھی گئے، اور امروہہ بھی۔ نوگاواں جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ اسی طرح کے ایک سفر کے دوران ہم رامپور میں اپنے ببّا کے گھر بھی گئے۔ ہمارے ایک جاننے والے صاحب نے وہ گھر خرید کر اس میں نئے دور کی تبدیلیاں کر لی تھیں۔ تبدیلیاں اتنی زیادہ تھیں کہ ہم اسے پہچاننے سے انکار کرنا چاہتے تھے کہ بچپن کی یادیں اس گھر کی اس حالت سے تو نہیں وابستہ ہو سکتی تھیں۔

قلعہ اور خاص باغ پیلس بھی بدل چکے تھے۔ آفیسرز میس کی خوبصورت عمارت کھنڈر بن چکی تھی اور

خالی پڑی تھی۔ اِس کے خوبصورت ستون کا پلاسٹر گر رہا تھا اور اندر کی اینٹیں نظر آنے لگی تھی۔ دیواروں پر کہیں خودرو بیلیں تھیں، اور کہیں کائی جمع تھی۔ یہ عمارت کیونکہ شہری علاقہ سے کچھ دور تھی اس لئے حکومتِ ہندوستان نے اس کا کوئی مصرف نہ سمجھا۔

رامپور : آفیسرز میس، ۱۹۷۹ء میں

اتنی ہجرتوں اور اتنے سفر کے بعد اب میں کیا ہوں؟ کیا میں سلطانہ بیگم ہوں، یا میں نقوی، مرزا، رامپوری، امروہوئی، کراچوی، اور لاہوری ہوں۔ اور یا میں سان فرانسسکن یا کیلیفورنیا کی امریکی ہوں، کہ مجبور، مہاجر ہوں ......

رقم تو کر دیئے رنج و الم کے افسانے
سنے گا کون کہ فرصت نہیں زمانے کو
اکیلے لکھتے رہو اور خود ہی پڑھتے رہو
آدا کے پاس بھی کب وقت ہے سنانے کو

سلطانہ ذاکر آدا

السوبرانتے، کیلیفورنیا، ۱۶ر فروری ۱۹۹۷ء